رجسٹرڈ نمبر آصفیہ (۱۲۰)
جلد (۴) عدد (۵)

رجسٹرڈ نمبر ایم (۲۹۵۰)
جمادی الاولیٰ ۱۳۵۳ھ

۷۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صہ) . بیرون ہند کے لئے (سے) قیمت فی پرچہ (۸/) ۱/

الجہاد فی الاسلام

تالیف

ابوالاعلیٰ مودودی

کتاب کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے اس کے صرف ایک باب (باب پنجم) کی فہرست ملاحظہ ہو

طریق جنگ اور مقصد جنگ کا فرق۔

اسلام سے پہلے عرب کا طریق جنگ۔ لغت اور ادب کی شہادت۔ جنگ کے محرکات: غنیمت کا شوق، تفاخر، خون کا انتقام۔ جنگ کے وحشیانہ طریقے: مثلہ، غیر مقاتلین کا قتل، زندہ جلانا، اسیران جنگ سے بدسلوکی، عورتوں کی بے حرمتی، غفلت میں حملہ کرنا، دشمن کی کھوپری میں شراب پینا، دھوکہ سے قتل کرنا، غدر و بدعہدی۔ عرب کی وحشیانہ جنگ کے چند نمونے: حرب داحس، حرب بسوس، حرب فجار، اوس و خزرج کی لڑائیاں۔

اسلام سے پہلے روم و ایران کا طریق جنگ۔ مذہبی مظالم، سفراء پر تعدی، بدعہدی، جنگ میں وحشیانہ اعمال، اسیران جنگ کی حالت۔

اسلام کی اصلاحات۔ مقصد جنگ کی تطہیر۔ طریق جنگ کی تطہیر: وحشیانہ افعال کے خلاف عام ہدایات، غیر مقاتلین کے قتل کی ممانعت، مثلہ کی ممانعت، قتل جریح و اسیر کی ممانعت، بدنظمی و انتشار کی ممانعت، لوٹ مار کی ممانعت، غفلت میں حملہ کرنے کی ممانعت، نذر آتش کرنے کی ممانعت، غارت گری و تباہ کاری کی ممانعت، قتل صبر کی ممانعت، قتل سفیر کی ممانعت، بدعہدی کی ممانعت، شور و ہنگامہ کی ممانعت، .... اسلامی طریق جنگ کا مکمل نمونہ: فتح مکہ

جنگ کے مہذب قوانین۔ اطاعت امام، وفائے عہد، عہد شکنی کے مقابلہ میں مسلمانوں کا طرز عمل، صلح و امان، اسیران جنگ، غنیمت۔ مفتوح قوموں کے ساتھ برتاؤ، معاہدین کے حقوق، غیر معاہدین کے حقوق، ذمیوں کے عام حقوق، ذمیوں کے لباس کا مسئلہ۔

چند مستثنیٰ واقعات۔ بنو نضیر کا اخراج، بنو قریظہ کا معاملہ، کعب بن اشرف کا قتل، یہود خیبر کا اخراج، اہل نجران کا اخراج۔

آخری تبصرہ، قوانین شریعت کے اصول استنباط۔ جدید قانون جنگ کی تدوین۔

کل کتاب کی ضخامت ۵۰۰ صفحہ۔ قیمت بلا جلد للعہ انگریزی۔ ۱۲/ سکہ عثمانیہ مجلد صہ انگریزی۔ ۱۲/ سکہ عثمانیہ

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے

فہرست مضامین

ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۳ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اشارات

ربیع الاول اور ربیع الثانی کے دونوں مہینے مجھ پر سخت جسمانی تکلیفوں کے ساتھ گذرے۔ ربیع الاول کا پرچہ طبیعت پر جبر کر کے حسب دستور مرتب کیا۔ مگر بیماری کی محنت نے دل اور دماغ پر ایسا برا اثر کیا کہ ربیع الثانی کے پرچے میں اشارات اور نقد و نظر کے سوا اور کچھ نہ لکھ سکا۔ جو مضامین مسلسل شایع ہو رہے تھے ان کا سلسلہ مجبوراً توڑنا پڑا۔ اور حل طلب مسائل جو آئے ہوئے تھے ان پر بھی کچھ نہ لکھا جا سکا۔ میں جانتا ہوں کہ اس سے "ترجمان القرآن" کے ناظرین کو تکلیف ہوئی ہوگی۔ مگر مجھے امید ہے کہ میری مجبوریوں کی طرف نظر کرتے ہوئے وہ مجھے معاف کر دیں گے۔ میں امکانی حد تک کوشش کرتا ہوں کہ رسالے کو بہتر سے بہتر مرتب کروں، اور مفید مضامین فراہم کروں۔ مگر افسوس ہے کہ چند مخلص احباب کے سوا کوئی میری مدد کرنے والا نہیں ہے۔ ہندوستان کے اہل علم جو اعلیٰ معیار کے مضامین لکھ سکتے ہیں، کوئی توجہ نہیں فرماتے۔ اور دست سوال دراز کرنے کی مجھے عادت نہیں، ناچار خود ہی جو کچھ بن پڑتا ہے، کرتا ہوں، اور جب تک دل و دماغ کی قوتیں ساتھ دیں گی، کیے جاؤں گا۔ جس خدا نے مجھ جیسے ایک عاجز اور حقیر بندے کو اس خدمت پر لگا لیا ہے اُسی سے امید ہے کہ یا تو مجھے تنہا خدمت بجا لانے کی قوت عطا کریگا یا میرے لئے چند مددگار پیدا کر دے گا۔ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۔

بعض احباب کا تقاضا ہے کہ "ترجمان القرآن" کو ابواب میں تقسیم کر دیا جائے۔ اور مستقل عنوانات کے تحت

مضامین درج کئے جایا کریں مجھے خود بھی ابتداء سے اس ضرورت کا احساس تھا۔ مگر مضامین کی قلت اس طریق ترتیب کو اختیار کرنے میں مانع تھی گو یہ مشکل اب بھی باقی ہے مگر اس کی وجہ سے رسالے کی اصلاح و ترقی میں مزید تعویق مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ لہٰذا اس مہینے سے نئی ترتیب کی ابتدا کی جاتی ہے۔ اب اس رسالے کے مستقل ابواب حسب ذیل ہونگے

اشارات۔

مقالات۔

تنزیل و تاویل اس باب میں تفسیری مباحث درج کئے جائیں گے۔

حاملان قرآن یہ باب مفسرین کے احوال اور قرآن مجید کی خدمت کے سلسلہ میں ان کے کارناموں کے بیان پر مشتمل ہوگا۔

رسائل و مسائل مراسلہ نگاروں کے شکوک و شبہات اور ان کے جوابات اس باب میں درج کئے جائینگے

تقریظ و انتقاد۔ اس باب میں خاص خاص کتابوں پر مفصل تبصرے ہونگے۔

مطبوعات۔ یہ باب مختصر تبصروں کے لئے مختص ہوگا۔

اس سلسلہ میں اگر ناظرین "ترجمان القرآن" کسی اور چیز کی ضرورت محسوس کرتے ہوں تو اپنے خیالات سے مجھے مطلع فرمائیں۔ اصلاح و ترقی کی ہر مناسب تجویز شکریہ کے ساتھ قبول کی جائیگی۔

جب سے ان صفحات میں حدیث کی بحث چھڑی ہے، میرے پاس پیہم خطوط آرہے ہیں جن میں طرح طرح کے شبہات پیش کئے جاتے ہیں معترضین کی کثرت اور ان شبہات پر غور کرنے سے میں جن نتائج پر پہنچا ہوں ان کو اختصار کے ساتھ بیان کئے دیتا ہوں۔

پہلی خرابی جس کا ہماری نئی نسلوں کو گمراہ کرنے میں بڑا حصہ ہے، ہمارے علما اور واعظین کی بے احتیاطی ہے! افسوس ہے کہ یہ حضرات زمانے کے رنگ کو نہیں سمجھتے۔ نہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جدید تعلیم اور جدید تہذیب نے

خیالات اور طبائع میں جو عظیم الشان انقلاب برپا کر دیا ہے، اس کی اہمیت اور معنویت کو انھوں نے صرف یہی نہیں کہ محسوس نہیں کیا، بلکہ اس کے ساتھ ایک حقارت آمیز بے اعتنائی کا رویہ اختیار کر رکھا ہے وہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں اب تک وہی باتیں لکھتے اور کہتے چلے جارہے ہیں جو اب سے سو برس پہلے کے لوگوں کو متاثر کر سکتی تھیں، مگر آج کل کے دماغوں پر اثر ڈالنے کے بجائے ان کو الٹا آمادۂ بغاوت کر دیتی ہیں۔ اسلام اور اس کے اصول و قوانین، قرآن حکیم اور اس کی تعلیمات، سنت رسولؐ اور اس کی ہدایات میں آج جتنے شبہات پیدا ہو رہے ہیں، ان کا بیشتر حصہ اصل ماخذ سے نہیں بلکہ انہی غلط تحریروں اور تقریروں سے پیدا ہوا ہے۔

قرآن حکیم کی تفسیر ہو یا سیرت رسول اکرم کا بیان، یا تعلیمات اسلام کی تشریح، ہر چیز میں آپ دیکھیں گے کہ تقریر کا بیشتر حصہ ضعیف اور موضوع روایات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور جو تھوڑی بہت صحیح روایتیں بیان کی بھی جاتی ہیں، ان کو پیش کرنے کا انداز ایسا ہوتا ہے، جس سے صاف اور سیدھی سی بات بھی ایک چیستان بن کر رہ جاتی ہے۔ عوام کی عجائب پسندی اور توہم پرستی کو آسودہ کرنے کے لئے یہ طریقہ خواہ کتنا ہی کارگر ہو، لیکن اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سننے والے ایک مولوی کی زبان سے موضوع اور ضعیف روایتوں کو سن کر صحیح سمجھنے لگتے ہیں، اور آیات قرآنی و احادیث نبوی کے انہی معانی کو مستند و معتبر قرار دیتے ہیں جو مولوی صاحب نے بیان کئے ہیں، پھر انہی معلومات کی بنیاد پر وہ قرآن و حدیث کے متعلق رائے قائم کرتے ہیں۔ اگر نئی روشنی کا اثر دماغ پر زیادہ پڑ چکا ہے تو کوئی شے ان کو اس نتیجہ تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی کہ اسلام بھی مذاہب باطلہ کی طرح خرافات اور توہمات کا مجموعہ ہے۔ اور اگر نئی روشنی کے ساتھ ایمان کا تھوڑا بہت نور بھی دل میں باقی ہوتا ہے تو نفس اسلام کے خلاف تو کوئی فتویٰ صادر کرنے کی جرأت نہیں ہوتی، البتہ قرآن اور حدیث اور فقہ، اور عقائد، اور عبادات و معاملات کے متعلق طرح طرح کے شبہات ابھرتے ہیں، اور ایک ایسی بے چینی قلب و روح میں پیدا ہو جاتی ہے جس کے اثر سے ایمان اور عمل دونوں پر شدید اضمحلال طاری ہو جاتا ہے۔

دوسری خرابی جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے پہلی خرابی کے مقابلہ میں کچھ کم نہیں ہے۔ خود اس گروہ میں موجود ہے جو اپنے آپ کو "تعلیمیافتہ" کہتا اور سمجھتا ہے۔ ان حضرات کو عقلیت کا بڑا دعویٰ ہے لیکن مذہب کے معاملہ میں جو روش انہوں نے اختیار کی ہے وہ سراسر عقل کے خلاف ہے، اور اتنے متناقض اصول اس میں جمع ہو گئے ہیں جن کے مجموعہ کو عقلیت سے موسوم کرنا عقلیت کو بے عقلیت کا ہم معنی بنا دینا ہے۔ عقلیت کا اصل الاصول یہ ہے کہ کسی مسئلہ میں کوئی رائے تحقیق کے بغیر قائم نہ کیجائے اور تحقیق کے معنی یہ ہیں کہ انسان دوسروں کی رائے اور دوسروں کے بیان پر اعتماد کرنے کے بجائے خود اپنی کوشش سے حقیقت کا سراغ لگائے، اور جس بات کی حقیقت وہ معلوم کرنا چاہتا ہے، اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ صحیح و معتبر ذرائع معلومات فراہم کرکے ان سے بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ پھر ایک صاحب عقل محقق کی شان یہ ہے کہ وہ وہم و گمان اور شک و شبہ پر اپنی رائے کی بنیاد نہیں رکھتا، بلکہ ہمیشہ رائے قائم کرنے کے لئے ایسی معلومات تلاش کرتا ہے جن پر وہ وثوق کے ساتھ اعتماد کر سکتا ہو لیکن ہمارے نام نہاد عقلیین کا حال یہ ہے کہ مذہب کے متعلق جو مستند ذرائع معلومات موجود ہیں ان کو ہاتھ نہیں لگاتے حقیقت کی چھان بین میں وقت اور محنت صرف کرنے پر تیار نہیں، چند سنی سنائی باتوں اور چند کتابوں کے سرسری مطالعہ سے جو سطحی معلومات ان کو حاصل ہو جاتی ہیں انہی پر اعتماد کرکے رائے قائم کر لیتے ہیں، اور پھر اس رائے کو بلا تکلف شائع کر دیتے ہیں، تاکہ خود جن شبہات میں مبتلا ہوئے ہیں ان میں دوسرے بھی گرفتار ہو جائیں۔

مذہب کے مسائل میں ان حضرات کے طرز عمل، خیالات، اور اقوال کا جو حال ہے اس پر اگر وہ خود غور کریں تو انھیں آپ ہی اپنی غیر معقولیت کا احساس ہو جائے۔ انھوں نے خود ہی دین کے علم اور دین کے معاملات کو ایک الگ گروہ کے لئے چھوڑ کر اسلام میں پادریت اور برہمنیت کی طرح "مولویت" Priesthood کی بنا ڈالی۔ انھوں نے خود ہی اپنی دنیا کا دائرہ دین کے دائرے سے الگ کر لیا، اور آپ ہی دنیا کے علوم

اور معاملات میں منہمک ہو کر دین کے علم اور اس کے معاملات سے بے تعلق ہوگئے۔ یہ تفریق اسلام میں نہ تھی۔ اسلام نے تو دین کے علم کو دنیوی علوم کے لئے رہنما، اور دینی اعمال کو دنیوی معاملات کے لئے مصلح قرار دیا تھا۔ اسلام کا تو اصل مقصد یہی تھا کہ قرآن کی شمع ہدایت تمہارے ہاتھ میں ہو اور اس کو لئے ہوئے تم خدا کی خدائی میں ہر طرف علم صحیح کی جستجو کرو۔ قرآن کا قانون اور رسول اکرم کا اسوۂ حسنہ تمہارے سامنے ہو اور اسی کے سانچے میں تمہاری زندگی کے سارے معاملات ڈھل جائیں مگر تم نے قرآن اور سنتِ رسول کو تو ایک ایسے گروہ کے حوالہ کیا جس کو دنیوی علوم اور دنیوی معاملات سے کچھ سروکار نہ تھا، اور خود اس نورِ ہدایت اور اس قانون کے بغیر علم و عمل کے میدانوں میں سفر شروع کر دیا۔ اس کا لازمی نتیجہ وہی ہوا جو دین اور دنیا کی اس غیر فطری تفریق کا ہونا چاہئے تھا۔ تمہارے افکار اور اعمال اسلامی فکر و عمل سے بہت دور ہٹ گئے۔ تمہارے دماغوں پر غیر اسلامی تخیلات اور تمہاری زندگی کے معاملات پر غیر اسلامی قوانین غالب آگئے۔ تمہارا قافلہ کعبہ کی سمت کو چھوڑ کر ترکستان کی طرف نکل گیا اور بہت دور نکل گیا۔ ایک طرف تم ہو کہ علم و عمل کی راہوں میں گرم سفر ہو، مگر تمہارے پاس کتاب اللہ و سنت رسول کی شمع ہدایت نہیں ہے۔ دوسری طرف تمہارے علما ہیں کہ اس شمع ہدایت کو سنبھالے ہوئے ہیں، مگر وہ نہ تو علم و عمل کی منزلوں میں تمہاری رہنمائی کر رہے ہیں اور نہ کر سکتے ہیں، کیونکہ وہ ان منازل کی رسم و راہ سے واقف ہی نہیں ہیں۔ اب جو خرابیاں ظاہر ہو رہی ہیں ان کا سارا الزام تم مولوی کے سر رکھتے ہو۔ حالانکہ "مولوی" سے زیادہ تم خود قابل الزام ہو۔ تم ہی نے "مولوی" کو مذہب کا ٹھیکا دیا۔ تم ہی نے قرآن پڑھنا اور سمجھنا چھوڑ دیا۔ تم ہی نے سنت رسول سے اپنا رشتہ منقطع کیا۔ تم ہی نے اسلام کے اصول اور قوانین کے علم کو اپنی تعلیم کی اسکیم سے خارج کیا۔ مولوی غریب نے تم سے کب اس کا مطالبہ کیا تھا؟ وہ بیچارہ تو ابتدا سے یہی کہہ رہا ہے کہ دنیوی علوم سیکھتے ہو تو ضرور سیکھو مگر خدا را دین کے علم کو نہ چھوڑو۔

دین اور دنیا کی تفریق کے جو لازمی نتائج تھے وہ جب سامنے آئے تو ہمارے نئے تعلیم یافتہ گروہ میں ایک

بے چینی پیدا ہوگئی، مگر بجائے اس کے کہ وہ اس بے چینی کے اصل سبب کو سمجھتے اور اس کا صحیح علاج کرتے، انہوں نے اسباب کی غلط تشخیص کی اور غلط علاج شروع کر دیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اپنی اس کوتاہی کو محسوس کرتے جو علوم دین سے بے بہرہ ہونے کی بدولت پیدا ہوئی تھی اور اس کی تلافی کے لئے سعی کرتے کہ اسی سعی پر اُن کے مرض کا علاج منحصر تھا لیکن اس صحیح راستہ کو چھوڑ کر انہوں نے بالکل غلط راستوں میں اپنی قوتیں صرف کرنی شروع کر دیں۔ وہ قرآن کو صحیح پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے مگر قرآن کی تفسیر و تاویل کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور عجیب و غریب نکتہ آفرینیاں کرتے ہیں جن کا قرآن کے علم سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ انہوں نے حدیث کے علوم سے کچھ بھی حاصل نہیں کیا، قرآن اور سنت کے باہمی تعلق کو بالکل نہ سمجھا۔ احادیث کو پرکھنے اور ان سے مسائل اخذ کرنے کے طریقوں کو جاننے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ فقہ کے مآخذ اور اس کے اصول کو معلوم کرنے میں تھوڑا سا بھی وقت صرف نہ کیا، مگر حال یہ ہے کہ ہر شخص ان مسائل پر رائے زنی کرنے کے لئے مستعد ہے کوئی صاحب فقہ پر تبرآزمائی کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ جب تک مسائل فقہ کا کوئی دوسرا بہتر مجموعہ تیار نہ ہو جائے، پرانے مجموعہ کو منسوخ کر دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی احمق ضابطۂ دیوانی و فوجداری کو منسوخ کر دے اور اس کی جگہ کوئی دوسرا ضابطہ نہ بنائے۔ ظاہر ہے کہ ایسی بغویات وہی شخص کر سکتا ہے جو ان قوانین کی اہمیت کو قطعاً نہیں سمجھتا۔ اسی طرح کچھ دوسرے حضرات اٹھتے ہیں اور احادیث پر کلام شروع کر دیتے ہیں۔ کوئی صاحب ہر اس حدیث کو بے تکلف موضوع اور ضعیف قرار دے بیٹھتے ہیں جو ان کی سمجھ میں نہیں آتی حالانکہ کسی حدیث پر وضع یا ضعف کا حکم لگانے کے لئے جن امور کی تحقیق ضروری ہے، ان سے وہ واقف تک نہیں۔ کوئی دوسرے صاحب احادیث کے غلط سلط ترجمے پڑھ کر ان سے عجیب عجیب مسائل کا استنباط کرتے ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اسلام کی اسپرٹ اور اس کے بنیادی اصول تک کو نہیں سمجھا۔ کوئی اور صاحب نہایت بے فکری کے ساتھ فتویٰ صادر کر دیتے ہیں کہ اسلام کے نظام دینی سے سنت رسول اور آثار صحابہ کو یک سر خارج کر دیا جائے حالانکہ اگر وہ اس دین کے نظام پر تھوڑا سا بھی غور کرتے۔ تو ان پر واضح ہو جاتا کہ داعی اسلام اور ان کے اولین تربیت یافتہ لوگوں کی سیرت اگر اسلام

سے خارج کردی جائے تو اسلام بہ حیثیت ایک مذہب اور بہ حیثیت ایک تہذیب کے قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ یہ سب اجتہاد بلا علم کے نتائج ہیں اور اگر اس کی روک تھام نہ ہوئی تو جو نقصان دین اور دنیا کے الگ ہونے سے مسلمانوں کو پہنچ چکا ہے، اس سے ہزار گنا زیادہ شدید نقصان اس غیر معقول طریقے سے دین میں دنیا کی بے بنیاد خلط پہنچا دے گی۔

ابھی چند روز ہوئے میرے پاس پنجاب کی ایک اسلامی انجمن کی طرف سے ایک پمفلٹ آیا ہے جس کا عنوان ضرورت حدیث ہے لکھنے والے خود انجمن کے سکرٹری صاحب ہیں۔ احادیث پر اصولاً ایمان رکھتے ہیں، حتیٰ کہ آقائے نامدار کے کسی قول سے انکار کرنے والے کو "ملعون" کہنے میں بھی دریغ نہیں کرتے لیکن فرماتے یہ ہیں کہ:

> ارباب غرض اور پیٹ پجاری، اجرت پر کام کرنے والے بیہودہ گوؤں کی ہزلیات (جنہوں نے اسلام کو بدنام کرنے میں غلط باتیں ہمارے بزرگوں کی طرف منسوب کر کے اسلام کو بدنام کیا ہے) ایک لمحہ کے لئے برداشت نہیں کر سکتے، اور ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ اسلامی لٹریچر سے ایسی روایات اور ایسے واقعات فوراً نکال دئے جائیں۔ بالخصوص صحیحین کی روایات کے سلسلہ میں جو ہیں ہر جگہ بدنام کرنے کا باعث ہے، علمائے اہل حدیث فوراً ایک الگ ضمیمہ شائع کریں۔

اس کے بعد مصنف نے ان احادیث کو پیش کیا ہے جو ان کے نزدیک اسلام کو بدنام کرنے والی ہیں اور شکایت کی ہے کہ "ہم مجبوراً مخالفین کے سامنے ان روایات کی وجہ سے لاجواب ہو کر شرمندہ ہوتے ہیں"۔ لطف یہ ہے کہ جو احادیث انہوں نے نقل کی ہیں ان میں سے اکثر صحیح ہیں۔ مگر چونکہ وہ ان احادیث کو نہیں سمجھتے، اور ان علوم کو بیکار سمجھ کر انہوں نے حاصل ہی نہیں کیا جن سے وہ ان کو سمجھ سکتے تھے، اور اس عدم علم کی وجہ سے وہ معترضین کے جواب دینے سے قاصر رہے اور اس قصور نے ان کو شرمندہ کیا۔ اس لئے انہوں نے اپنے قصور کی تلافی کرنے کے بجائے آسان ترین راستہ یہ اختیار فرمایا کہ ان حدیثوں کو "ہزلیات" قرار دیں ان کے راویوں کو جن کی پوری پوری

زندگیاں دین کی خدمت میں صرف ہوئی تھیں " ارباب غرض " " پیٹ پجاری " " اُجرت پر کام کرنے والے " " بیہودہ گو " " اسلام کو بدنام کرنے والے " اور ایسی ہی دوسری گالیوں سے یاد کریں ' اور مطالبہ فرمائیں کہ ہر اس حدیث کو اسلامی لٹریچر سے خارج کر دیا جائے جس کو کوئی ناواقف مسلمان نہ سمجھ سکتا ہو ، اور جس پر دشمنان اسلام کے اعتراضات سُن کر اسے اپنی ناواقفیت کے باعث شرمندہ اور لاجواب ہونا پڑے ۔ یہ ان حضرات کی منطق ہے اور یہ اس معقولیت کا ایک ادنیٰ سا نمونہ ہے جس پر یہ حضرات فخر فرماتے ہیں ۔

یہاں موقع نہیں کہ ان تمام احادیث پر کلام کیا جا سکے جن کو صاحب موصوف نے پیش فرمایا ہے مگر نمونہ کے طور پر میں صرف ایک حدیث پر بحث کرونگا جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے تعلیمیافتہ حضرات دشمنان اسلام کے کیسے کیسے لغو اعتراضات سے مرعوب ہو کر خود اپنے قلعہ پر پلٹ پڑتے ہیں اور جھنجلا کر اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہتے ہیں ۔ حدیث کو جن الفاظ میں انہوں نے نقل کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں :۔

" حضور کا فرمانا کہ اذان سُن کر شیطان گوز کرتا ہوا بھاگتا ہے "

اس حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں :۔

اذا نودی لِلصَّلٰوۃ ادبر الشیطان	جب نماز کے لئے ندا کی جاتی ہے تو شیطان پیٹھ پھیر کر بھاگتا
له ضراط حتیٰ لا یسمع التاذین فاذا	ہے ۔ اور اس کے گوز صادر ہوتے ہیں کہ اذان نہ سنے
قضی النداء اقبل حتیٰ اذا ثوب	پھر جب اذان ختم ہوتی ہے تو پلٹ آتا ہے پھر جب نماز
للصلوٰۃ ادبر حتیٰ اذا قضی التثویب	کے لئے تکبیر اقامت کہی جاتی ہے تو پھر بھاگتا ہے اور جب
اقبل حتیٰ یخطر بین المرء و نفسه	تکبیر ختم ہو جاتی ہے تو واپس آجاتا ہے کہ خطرے ڈالے
یقول اذکر کذا لما لم یکن یذکر	آدمی اور اس کے نفس کے درمیان کہتا ہے کہ فلاں
حتیٰ یظل الرجل لا یدری کم صلے	بات یاد کر فلاں بات یاد کر ۔ ایسی ایسی باتیں یاد دلاتا ہے

جن کا اس کو نماز سے پہلے خیال تک نہ تھا۔ حتیٰ کہ آدمی بھول جاتا ہے کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھیں۔

حدیث کی روایت میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی بنا پر وضع یا ضعف کا حکم لگایا جا سکے اس کو امام بخاری نے خفیف سے لفظی تغیر کے ساتھ تین مختلف ابواب میں تین طریقوں سے روایت کیا ہے۔ کتاب الصلوٰۃ باب فضل التاذین میں عبداللہ بن یوسف۔ مالک۔ ابوالزناد۔ اعرج اور ابوہریرہ اس کے راوی ہیں۔ باب تفکر الرجل الشئ فی الصلاۃ میں یحییٰ بن بکیر۔ لیث۔ جعفر بن ربیعہ۔ اعرج اور ابوہریرہ نے اس کو روایت کیا ہے۔ اور کتاب بدء الخلق۔ باب صفت ابلیس وجنودہ میں محمد بن یوسف۔ اوزاعی۔ یحییٰ بن ابی کثیر۔ ابوسلمہ اور ابوہریرہؓ کے نام اس کے اسناد میں نظر آتے ہیں۔ نسائی نے بھی باب فضل التاذین میں اس روایت کو نقل کیا ہے۔ سلسلۂ اسناد میں قتیبہ اور مالک آئے ہیں۔ مسلم نے بھی باب فضل الاذان میں اس مضمون کی پانچ روایتیں نقل کی ہیں جن میں سے بعض میں لہ ضراط کی جگہ لہ حصاص آیا ہے جس کی تفسیر اصمعی نے شدت فرار سے کی ہے۔ ایک اور حدیث جو مسلم نے جابر سے نقل کی ہے، یہ ہے کہ شیطان جب اذان کی آواز سنتا ہے تو روحاء تک بھاگتا چلا جاتا ہے۔ روحاء ایک مقام ہے مدینہ سے کئی میل کے فاصلہ پر۔

اب رہا متن حدیث تو اس میں جو کچھ ارشاد ہوا ہے اس کی صداقت پر ہر نماز پڑھنے والا گواہی دے سکتا ہے۔ اذان اور تکبیر کی آواز سن کر فی الواقع انسان خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور اس وقت کوئی خطرہ اس کے قلب میں نہیں آتا۔ مگر نماز شروع کرتے ہی طرح طرح کے وسوسے آنے لگتے ہیں۔ اس کیفیت کو مختلف پیرایوں میں بیان فرمایا گیا ہے۔ مقصود صرف یہ بتانا تھا کہ اذان کی آواز سے شیطان بھاگ جاتا ہے۔ اس میں فرار کی شدت کو ظاہر کرنے کے لئے کہیں فرمایا گیا ہے کہ وہ روحاء تک بھاگتا چلا جاتا ہے یعنی میلوں تک نہیں ٹھیرتا۔ کہیں وہی مفہوم لہ حصاص کے لفظ سے ادا فرمایا ہے اور کہیں لہ ضراط کہہ کر شدت کے ساتھ کراہت کا بھی اظہار کر دیا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم اردو میں کہیں کہ شیطان دُم دبا کر بھاگ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ محض استعارہ ہوگا۔

اب اگر کوئی شخص اس مجازی کلام کو حقیقت پر محمول کرے اور یہ فرض کرے کہ شیطان واقعی ایک دُم رکھتا ہے اور بھاگتے وقت اس کو ٹانگوں میں دبا لیتا ہے تو یہ قائل کے بیان کا نہیں، سامع کی عقل کا قصور ہوگا۔ اسی طرح شیطان کے گوز کرتے ہوئے بھاگنے سے بھی اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ شیطان واقعی پیٹ رکھتا ہے اور اس میں غذا ہضم ہوتی ہے، اور اس سے ریاح خارج ہوتے ہیں، تو یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ وہ یکسر کودن آدمی ہے۔ بات کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ ایسی باتوں پر اعتراض کرنے والے تو محض فتنہ پرداز ہیں۔ ان کے دلوں پر مہر لگی ہوئی ہے جو انھیں سیدھی سی بات کو بھی سیدھی طرح نہیں سمجھنے دیتی۔ مگر افسوس ان مسلمانوں پر ہے جو ایسے اعتراضات کو سن کر لاجواب اور شرمندہ ہوتے ہیں۔

غور کیجیے کہ صاحب مضمون نے یہ تحقیق کرنے کی کوئی تکلیف گوارا نہ کی کہ حدیث کن طریقوں سے نقل ہوئی ہے؟ سلسلۂ اسناد مسلسل ہے یا منقطع؟ راوی ضعیف ہیں یا ثقہ؟ کن کن ائمہ نے اس کو لیا ہے؟ یہ سب سوالات جن پر حدیث کی صحت یا عدم صحت کا حکم منحصر ہے، ان کے نزدیک محض بے معنی ہیں۔ انہوں نے تو بس یہ دیکھ لیا کہ حدیث میں شیطان کے گوز صادر کرنے کا ذکر ہے، اور چونکہ یہ ان کے نزدیک شرمناک بات تھی جس پر مخالفین کے سامنے ان کو مجبوراً لاجواب ہو کر شرمندہ ہونا پڑتا تھا، اس لئے بلا تکلف انہوں نے فرض کر لیا کہ اس کو ضرور کسی "پیٹ پجاری" "بیہودہ گو" نے "اسلام کو بدنام کرنے کے لئے" "گھڑ لیا ہوگا"! اور اب اسلام کو بدنامی سے بچانے کے لئے لازم ہے کہ یہ حدیث فوراً اسلامی لٹریچر سے خارج کر دی جائے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ اگر صاحب مضمون کو اصول روایت کے لحاظ سے حدیث پر نقد کرنے کی فرصت نہ تھی، تو کیا اتنی بھی فرصت نہ تھی کہ بخاری شریف میں اصل حدیث نکال کر اس کے پورے الفاظ پڑھ لیتے، اس کے مفہوم و مدعا کو سمجھتے اور عقل سے کام لے کر غور کرتے کہ اس میں شرمناک بات کونسی ہے؟ جو لوگ اسلام کے اصلی مآخذ کو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے تھوڑا سا وقت بھی نہیں نکال سکتے ان کو یہ حق آخر کہاں سے حاصل ہو گیا ہے کہ اسلام کے وکیل بن کر کھڑے ہوں اور اپنے غریب موکل کی مسل میں سے جتنے ورق چاہیں پھاڑ پھینکیں۔

مقالات

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

(۱۵)

ایمان

۵- ایمان بالیوم الآخر

دنیا اور اسلام کے انجام پر دو مذہبوں کی رائیں آپ سن چکے ہیں اور یہ بھی آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ دونوں مذہب نہ عقلاً صحیح ہیں، نہ ان فطری سوالات کا پورا پورا اور دل کو مطمئن کرنے والا جواب دیتے ہیں جو دنیا میں زوال و فنا کے آثار کو دیکھ کر ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، اور نہ ان میں یہ صلاحیت ہے کہ ایک صحیح اور مضبوط اخلاقی نظام کے لئے پشت پناہ بن سکیں۔ اب تیسرے مذہب کا بیان سنیے۔

حیاتِ اُخروی کا عقیدہ تیسرا مذہب کہتا ہے کہ:-

(۱) جس طرح دنیا کی ہر چیز فرداً فرداً اپنی ایک عمر رکھتی ہے جس کے ختم ہو جانے کے بعد اس میں فساد رونما ہو جاتا ہے، اسی طرح اس پورے نظام عالم کی بھی ایک عمر ہے جس کے تمام ہونے پر یہ سارا کارخانہ درہم برہم ہو جائیگا، اور کوئی دوسرا نظام اس کی جگہ لے گا جس کے قوانین طبیعی اس نظام کے قوانین طبیعی سے مختلف ہوں گے

(۲) اس نظام کے درہم برہم ہونے پر ایک زبردست عدالت قائم ہوگی جس میں ہر چیز کا حساب لیا جائیگا۔ انسان کو اس روز پھر ایک نئی جسمانی زندگی ملیگی۔ وہ اپنے خدا کے سامنے حاضر ہوگا، اس کے تمام اعمال جو اس نے اپنی پہلی زندگی میں انجام دیے تھے، ٹھیک ٹھیک جانچے اور تولے جائیں گے، حق اور انصاف

کے ساتھ اس کے مقدمے کا فیصلہ کیا جائیگا، اچھے اعمال کی اچھی جزا ملیگی اور بُرے اعمال کی بُری سزا دی جائیگی۔

۴۔ انسان کی دنیوی زندگی دراصل اس کی اخروی زندگی کا مقدمہ ہے۔ یہ زندگی عارضی ہے اور وہ پائیدار۔ یہ ناقص ہے، اور وہ کامل۔ تمام اعمال کے پورے پورے نتائج اس عارضی زندگی میں مترتب نہیں ہوتے، اور نہ ہر وہ بیج جو یہاں بویا جاتا ہے اپنے فطری ثمرات کے ساتھ اس ناقص زندگی میں بار آور ہوتا ہے۔ اس نقص کی تکمیل اُس دوسری زندگی میں ہوگی، اور جو کچھ یہاں بے نتیجہ اور بے ثمرہ گیا ہے۔ وہ اپنے حقیقی نتائج اور حقیقی ثمرات کے ساتھ وہاں ظاہر ہوگا۔ لہٰذا انسان کو اپنے اعمال و افعال کے محض اُن ناتمام اور بسا اوقات دھوکہ دینے والے نتائج ہی پر نظر نہ رکھنی چاہیے جو اس دنیوی زندگی میں مترتب ہوتے ہیں، بلکہ ان مکمل، پائیدار اور حقیقی نتائج پر بھی نظر رکھنی چاہئے جو اس دوسری زندگی میں مترتب ہوں گے، اور نتائج کے اس مکمل سلسلہ کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے افعال کی قدریں متعین کرنی چاہئیں۔

یہ وہ مذہب ہے جسے انبیا علیہم السلام نے پیش کیا ہے، اور قرآن مجید اسی مذہب کا پرزور وکیل ہے مگر قبل اس کے کہ ہم اس مذہب کے اخلاقی نتائج اور تہذیب اسلامی میں اس کے رتبے اور اہمیت پر کلام کریں ہمیں دیکھنا چاہئے کہ اس مذہب کے دلائل کیا ہیں؟ اور عقل کہاں تک اس کو قبول کرتی ہے؟

عقلی تحقیق کا صحیح طریقہ یہ سوال کہ موت کے بعد کوئی زندگی ہے یا نہیں، ان امور سے تعلق رکھتا ہے جو ہمارے حواس اور حسی تجربہ کی حدود سے باہر ہیں۔ ہم جو کچھ محسوس کرتے ہیں وہ صرف اس قدر ہے کہ ایک شخص جو چند لمحہ قبل تک سانس لیتا اور اپنے ارادہ سے حرکت کرتا تھا وہ اب زندگی کے تمام آثار سے محروم ہو گیا، اور اس کے جسم سے کوئی ایسی شے غائب ہو گئی جس نے اس جامد، غیر نامی، غیر متحرک مادے کو نمو اور حرکت کی قوت مہیا کر رکھی تھی۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ شے کہاں چلی گئی؟ جسم سے الگ ہو کر بھی موجود ہے یا معدوم ہو گئی؟ اور پھر کبھی اس جسم یا ایسے ہی کسی اور جسم سے اس کا تعلق دوبارہ قائم ہوگا یا نہیں؟ تو جہاں تک ہمارے حواس اور تجربی علم کا تعلق ہے، ہم اس سوال کا نفیاً یا اثباتاً کوئی جواب نہیں دے سکتے کیونکہ اس چیز کو فی نفسہٖ نہ ہم نے پہلے کبھی محسوس کیا تھا اور نہ اب محسوس کرتے

ہیں۔ اس بنا پر یہ بات پہلے ہی سمجھ لینی چاہئے کہ اس سوال کا سائنس یعنی حکمت عملی یا تجربی علم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ سائنس اگر اس پر اثباتاً کوئی حکم نہیں لگا سکتا، تو نفیاً بھی کوئی حکم لگانے کا حق نہیں رکھتا۔ وہ صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ "میں کچھ نہیں جانتا کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے"۔ لیکن اگر وہ خالص لاادریت کے مقام سے ہٹ کر یہ کہے کہ "چونکہ میں نہیں جانتا کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے اس لئے میں جانتا ہوں کہ مرنے کے بعد کچھ نہیں ہوتا" تو یقیناً معقولیت کی حدود سے تجاوز کر جائیگا۔

حواس کے بعد ہمارے پاس علم کا دوسرا ذریعہ "تفکر" ہے۔ انسان ہمیشہ اپنے آپ کو محسوسات کے دائرے میں مقید رکھنے سے انکار کرتا رہا ہے، اور اس کی بشری فطرت کا مقتضا یہی ہے کہ وہ غور و فکر کی قوتوں سے کام لے کر ان پوشیدہ حقیقتوں کو معلوم کرے جو محسوسات سے ماوراء ہیں۔ اسی فکری جستجو کا نام "تفکر" ہے اور اس کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ تم دنیا اور خود اپنے نفس کے آثار و شواہد سے آنکھیں بند کر کے، یا ایک بڑی حد تک بے پروا ہو کر خالص عقلی مقدمات سے نتائج اخذ کرنا شروع کرو، اور آخر تک عقل کے گھوڑے دوڑاتے چلے جاؤ۔ یہ خالص فلسفے کا میدان ہے، اور تمام گمراہیوں کی جولانگاہ یہی اندھیری منزل ہے یہیں سے وہ فلسفیانہ مذاہب نکلے ہیں جن میں الجھ کر انسان تخیل کی وادیوں میں بھٹکتا چلا جاتا ہے یہیں سے خدا اور ملائکہ اور نظام عالم اور حیات بعد الموت کے متعلق وہ مختلف اور متضاد عقیدے نکلے ہیں جو محض اندھیرے میں ٹٹولنے اور وہم و گمان اور خرص و تخمین پر چلنے کا نتیجہ ہیں۔

دوسرا طریقۂ فکر یہ ہے کہ تم آنکھیں کھول کر کائنات میں اور خود اپنے نفس میں ان آثار کا مشاہدہ کرو جو منزل حقیقت کے مشعل بردار ہیں، اور ان چراغوں کو لے کر عقل سلیم و فکر صحیح کی مدد سے ان حقیقتوں تک پہنچو، جو ان آثار کی تہ میں چھپی ہوئی ہیں۔ اس دوسرے طریقے میں سائنس اور فلسفہ دونوں مل کر چلتے ہیں۔ اگرچہ حقیقت تک پہنچنے کا یقینی ذریعہ یہ بھی نہیں ہے لیکن آسمانی ہدایت سے قطع نظر کر کے انسان کے پاس حقیقت رسی کا واحد ذریعہ یہی ہے، اور اس ذریعہ سے حقیقت تک یا اس کے قریب تک پہنچ جانا ممکن ہے بشرطیکہ انسان کی قوت مشاہدہ تیز ہو، اس کی ادراکی

قوتیں لطیف اور نازک ہوں، اور اس میں غور و فکر کی کافی صلاحیت موجود ہو۔ حکمت نظری میں انسان کی ترقی کا مدار اسی مشاہدہ اور تفکر کی آمیزش پر ہے۔ آج جن نظریات پر حکمت کی بنیاد قائم ہے اور جن اصولوں پر ایمان لائے بغیر سائنس کا کوئی طالب علم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا، ان میں سے کوئی بھی محض تجربے اور مشاہدہ پر مبنی نہیں ہے ہر نظریے اور ہر اصول کی بنیاد اس قیاس عقلی پر قائم ہے جس کے لئے مشاہدات و تجربات کو مواد قیاس کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ قانون فطرت، قانون جذب و کشش، سلسلہ علت و معلول، نظریہ اضافیت، قانون نشو و ارتقاء، قانون انتخاب طبیعی، اور ایسے ہی دوسرے اصول و قوانین جن پر بڑے بڑے اہل حکمت ایمان لائے ہیں، سب کے سب آثار و مظاہر کے مشاہدات پر غور و فکر اور عقلی قیاس آرائی کے استعمال کا نتیجہ ہیں۔ ورنہ آج تک کسی نے بھی ان قوانین اور ان اصول کا حسی مشاہدہ نہیں کیا ہے۔ پھر جو نتائج ایک حکیم اپنے مشاہدے اور قیاس سے مستنبط کرتا ہے ان پر اسے اتنا ہی یقین ہوتا ہے جتنا کسی عامی کو کسی شے کے حسی مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے مگر اس کے باوجود کوئی بڑے سے بڑا حکیم بھی کسی منکر کو ان نتائج کے ان لینے پر مجبور نہیں کر سکتا، کیونکہ جب تک کوئی شخص آثار و مظاہر کا اس خاص نظر سے مشاہدہ نہ کرے جس سے حکیم نے مشاہدہ کیا ہے، اور اسی غور و فکر سے کام نہ لے جس سے حکیم نے کام لیا ہے، وہ ان نتائج پر کسی طرح نہیں پہنچ سکتا۔ ایک عامی کے لئے حکمت میں قدم رکھنے اور ترقی کرنے کی بس یہی صورت ممکن ہے کہ وہ جس حکیم کی دانائی و بصیرت پر اعتقاد رکھتا ہو، اس کے اخذ کردہ نتائج پر ایمان بالغیب لے آئے، بغیر اس کے کہ وہ خود اپنے مشاہدہ اور اپنے غور و فکر سے ان نتائج تک پہنچا ہو۔

یہ مقدمہ ذہن نشین کر لیجئے کیونکہ امور ماوراء طبیعت کے باب میں قرآن مجید کے بیان اور استدلال کو سمجھنے کے لئے اس مقدمہ کو سمجھ لینا ضروری ہے اور بہت سی غلط فہمیاں اسی کے نہ سمجھنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اب ہم کو حیات اخروی کے متعلق قرآن مجید کے بیان کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

حیات اخروی پر منکرین کا اعتراض

حیات اخروی کا اعتقاد جب قرآن مجید نے پیش کیا تو اس کے خلاف اس وقت کے منکرین نے جو اعتراض کیا تھا وہ وہی تھا جو آج کے منکرین کرتے ہیں۔ اور درحقیقت اس پر یہی ایک اعتراض

ممکن بھی ہے یعنی یہ کہ مرنے کے بعد پھر زندہ ہونا ایک بعید از عقل و قیاس بات ہے۔ ہم کس طرح مان لیں کہ جو مردے زمین میں گل سڑ گئے، جن کے جسم خاک میں مل گئے، جن کے اجزائے جسم ہوا، زمین اور پانی میں منتشر ہو گئے ان کو پھر زندگی میسر ہوگی؟

وَقَالُوٓا۟ ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِى الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِىْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ (۳۲: ۱۰) — اور انہوں نے کہا کہ جب ہم زمین میں گم ہو جائیں گے تو کیا ہم پھر نئے سرے سے پیدا ہوں گے؟

وَقَالُوٓا۟ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا (۱۷: ۴۹) — اور انہوں نے کہا کہ جب گل سڑ کر ہماری صرف ہڈیاں رہ جائیں گی، اور ہم ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم از سر نو پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے؟

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ (۵۰: ۳) — کیا جب ہم مر کر مٹی بن جائیں گے تو پھر جی اٹھیں گے، یہ واپسی تو بعید از عقل و قیاس ہے۔

مَنْ يُّحْىِ الْعِظَامَ وَهِىَ رَمِيْمٌ (۳۶: ۷۸) — کون ہے جو ہڈیوں کو زندہ کرے گا درانحالیکہ وہ بوسیدہ ہو چکی ہوں۔

قرآن مجید کا طرز استدلال اس شبہ کے مقابلہ میں قرآن مجید نے جو طرز استدلال اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے وہ قدرت الٰہی کے آثار کا مشاہدہ کرنے اور ان پر غور و فکر کرنے کی طرف دعوت دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ۔ (۴۱: ۵۳) — ہم ان کو آفاق میں اور خود ان کے اپنے نفوس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ یہی حق ہے۔

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِىْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (۷: ۱۸۵) — کیا وہ آسمانوں اور زمین کے انتظام پر غور نہیں کرتے۔

وَفِىْٓ اَنْفُسِكُمْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۵۱: ۲۱) — اور خود تمہارے اندر جو نشانیاں ہیں کیا ان کو بھی تم نہیں دیکھتے؟

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۔ (۱۲:۱۰۵)

آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے وہ اس طرح گذر جاتے ہیں کہ ان پر غور ہی نہیں کرتے۔

یہ اشارہ ہے اس طرف کہ تم کو اتنی قوت تو نہیں دی گئی ہے کہ جو چیز تمہارے حواس سے پوشیدہ ہے اس کو تم برأی العین مشاہدہ کر سکو، یا کسی تجربہ سے اس کی حقیقت معلوم کر سکو۔ البتہ اگر تم آنکھیں کھول کر ان آثار کو دیکھو جو شب و روز تمہارے سامنے پیش ہو رہے ہیں، اور زمین و آسمان کے انتظام کا مشاہدہ کرو، اور خود اپنے نفس کی پیدائش پر نظر کرو، اور ان سب محسوسات و مشاہدات پر غور و فکر کر کے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرو۔ تو تم کو معلوم ہو جائیگا کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ درست ہے۔

حیاتِ اخروی کا امکان پھر وہ انہی آثار و مظاہر میں سے ان چیزوں کو پیش کرتا ہے جو سب سے زیادہ بدیہی ہیں، اور ان سے استدلال کرتا ہے کہ جس بات کو تم بعید از عقل و قیاس سمجھ رہے ہو، وہ چاہے تمہاری عقل و قیاس سے دور ہو، مگر حقیقت میں ناممکن نہیں ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَاءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۔ (۱۳:۱)

وہ اللہ ہی تو ہے جس نے آسمانوں کو ایسے ستونوں کے بغیر بلند کر رکھا ہے جو تم کو نظر آسکیں۔ پھر وہ عرش پر جلوہ فرما ہوا، اور سورج اور چاند کو اپنا تابع فرمان کیا۔ ان میں سے ہر ایک، ایک مدت مقررہ تک کے لئے حرکت کر رہا ہے۔ وہی تمام عالم کا انتظام کرتا ہے اور وہ اپنی نشانیاں تمہارے کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات پر یقین لاؤ۔

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا ۔ (۷۹:۲۷)

کیا تمہارا پیدا کرنا زیادہ دشوار ہے یا آسمان کا؟ خدا نے تو (ایسی بڑی چیز) کو بنایا ہے؟

یہ اجرام سماوی کے آثار سے استشہاد ہے کہ جس خدا نے اتنا بڑا انظام کائنات پیدا کیا ہے،

جس نے بڑے بڑے سیاروں کو اپنے قانون کی بندشوں میں جکڑ رکھا ہے، جس کی قدرت ان عظیم الشان اجرام کو اس انتظام کے ساتھ حرکت دے رہی ہے کہ کوئی جرم اپنے مدار سے بال برابر تجاوز نہیں کر سکتا، نہ اپنے مقررہ اوقات سے پل بھر کے لئے ہٹ سکتا ہے۔ اور جس کی طاقت نے کائنات کے طبقوں کو ایسے غیر مرئی اور غیر محسوس سہاروں پر قائم کیا ہے جن کے ادراک سے تم عاجز ہو، اُس خدا کے متعلق یہ گمان کرنا کہ وہ تم جیسی حقیر مخلوق کو ایک دفعہ ہلاک کر کے دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہیں ہے، کیسی بڑی خام خیالی ہے؟

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ قَادِرٌ عَلَىٰ أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ (۱۷ : ۱۱)

کیا وہ نہیں دیکھتے کہ جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے وہ ان جیسوں کو بھی پیدا کرنے پر قادر ہے۔

آسمان کے بعد وہ ہمارے قریب ترین ماحول یعنی زمین کے آثار کی طرف ہم کو متوجہ کرتا ہے۔

سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللَّهُ يُنْشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲۹ : ۲)

زمین کی سیر کرو اور دیکھو کہ اللہ نے کس طرح آفرینش کی ابتدا کی ہے اور پھر اللہ چیزوں کو دوبارہ زندگی بخشتا ہے یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

وَآيَةٌ لَهُمُ الْأَرْضُ الْمَيْتَةُ أَحْيَيْنَاهَا وَأَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَأْكُلُونَ۔ (۳۶ : ۲)

اور ان کے لئے ایک نشانی تو مردہ زمین ہی ہے جس کو ہم نے زندگی بخشی اور اس سے غلہ نکالا ہے جسے یہ لوگ کھاتے ہیں

فَانْظُرْ إِلَىٰ آثَارِ رَحْمَتِ اللَّهِ كَيْفَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا إِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ (۳۰ : ۵)

پھر اللہ کی رحمت کے آثار دیکھ کہ کس طرح زمین کو مردہ ہو جانے کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ یقیناً وہ ضرور مُردوں کو بھی زندگی عطا کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنَّكَ تَرَى الْأَرْضَ خَاشِعَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ

اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تو زمین کو دیکھتا ہے کہ سُونی پڑی ہے، پھر جہاں ہم نے پانی برسایا اور وہ

إِنَّ الَّذِي أَحْيَاهَا لَمُحْيِي الْمَوْتَىٰ إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۴۱:۵)۔

بھبک اٹھی اور لہلہانے لگی۔ تو جس نے اس کو زندہ کیا وہی مُردوں کو بھی زندہ کرنے والا ہے یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

وَهُوَ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيَاحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا فَسُقْنَاهُ إِلَىٰ بَلَدٍ مَيِّتٍ فَأَحْيَيْنَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا كَذَٰلِكَ النُّشُورُ (۳۵:۲)۔

اور وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو چلاتا ہے پھر وہ بادلوں کو ابھارتی ہیں پھر ہم ان بادلوں کو ایسی بستی کی طرف لے جاتے ہیں جو بے آب و گیاہ پڑی ہے، پھر اس مردہ پڑی ہوئی زمین کو بارش کے ذریعہ سے زندہ کردیتے ہیں بس ایسا ہی جی اٹھنا قیامت میں بھی ہوگا۔

اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ ہر طرف سے آنکھیں بند کرکے ذرا خود اپنے نفس ہی پر غور کرو کہ خود تمہارے اندر ہی خدا کے احیاء موتی پر قادر ہونے کا ثبوت موجود ہے۔

هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا۔ (۷۶:۱)

بلاشبہ انسان پر زمانہ کا ایک ایسا وقت بھی گذرا ہے جب کہ وہ کوئی قابل ذکر شئے نہ تھا۔

كُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (۲:۳)۔

تم مردہ تھے تو خدا نے تم کو زندہ کیا پھر وہ تم کو مردہ کردیگا پھر زندہ کرے گا پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤگے۔

إِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ (۲۲:۱)۔

اگر تم کو مرنے کے بعد جی اٹھنے میں شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے مٹی جیسی بے جان شئے سے تم کو پیدا کیا ہے۔

قَالَ مَن يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ (۳۶:۵)

اس نے کہا کہ کون ہڈیوں کو زندہ کرے گا جبکہ یہ بوسیدہ ہوجائیں گی۔ کہدے کہ ان کو وہی زندہ کریگا جس نے انہیں پہلی بار زندگی بخشی تھی۔

قُلْ كُونُوا حِجَارَةً أَوْ حَدِيدًا أَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِي صُدُورِكُمْ فَسَيَقُولُونَ مَن يُعِيدُنَا قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ (۱۷ : ۵)۔

ان سے کہو کہ تم پتھر بن جاؤ یا لوہا یا کوئی اور ایسی چیز جس کا زندہ ہونا تمہارے نزدیک بہت ہی بعید از عقل ہو، پھر وہ پوچھیں کہ کون ہم کو دوبارہ زندہ کرے گا؟ تو کہو کہ وہی جس نے پہلی بار تم کو پیدا کیا تھا۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ثُمَّ إِنَّكُم بَعْدَ ذَٰلِكَ لَمَيِّتُونَ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ ۔ (۲۳ : ۱)

ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا ہے، ہم نے ہی اس ست کو نطفہ بنا کر ایک حفاظت کی جگہ میں رکھا، پھر نطفہ کو لوتھڑا بنایا، پھر لوتھڑے کو مضغۂ گوشت کی صورت دی، پھر مضغہ کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اس کو ایک دوسری چیز بنا کھڑا کیا، پس مبارک ہے اللہ جو بہترین خالق ہے، پھر اس کے بعد تم ضرور مرنے والے ہو، پھر یقیناً تم قیامت کے روز اٹھائے جاؤ گے۔

أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَىٰ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ أَلَيْسَ ذَٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَن يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ ۔ (۷۵ : ۲)۔

کیا انسان منی کا محض ایک قطرہ نہ تھا جو رحم مادر میں ٹپکایا گیا تھا۔ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا۔ پھر خدا نے اس کو انسانی شکل دی اور اس کی ساخت کو استوار کیا، پھر اس کی دو صنفیں کر دیں اور مرد و عورت کے جوڑے بنائے۔ کیا وہی خدا اس پر قادر نہیں کہ مُردوں کو زندہ کرے۔

ان صاف اور واضح اور ہمارے مشاہدہ و احساس سے قریب تر شواہد کو پیش کرنے کے بعد قرآن مجید

ایک ایسی عملی ہوی دلیل پیش کرتا ہے جو بالکل عقل عام (Common Sense) سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اشیار کو عدم سے وجود میں لانا زیادہ مشکل ہے بہ نسبت اس کے کہ ان کو منتشر اور پراگندہ ہو جانے کے بعد دوبارہ پہلی صورت پر پیدا کیا جائے پس جو طاقت اس دشوار تر کام کو انجام دینے سے عاجز نہ ہوئی، وہ آسان تر کام کو انجام دینے سے کیونکر عاجز ہو سکتی ہے؟ اگر ایک شخص موٹر ایجاد کرنے پر قادر ہے اور اس کو بنا چکا ہے تو کیا یہ بات عقل میں آ سکتی ہے کہ وہ موٹر کے پرزوں کو الگ الگ کرنے کے بعد دوبارہ ان کو جوڑ دینے پر قادر نہیں ہے؟ اسی مثال پر قیاس کر لو کہ صانع عالم جو تم کو عدم سے وجود میں لایا ہے، تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کرنے سے ہرگز عاجز نہیں ہو سکتا۔

أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللَّهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ (۲:۲۹)	کیا وہ نہیں دیکھتے کہ اللہ کس طرح آفرنیش کی ابتدا کرتا ہے؟ پھر اسی طرح وہ اس کا اعادہ بھی کریگا اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے لئے یقیناً زیادہ آسان ہے۔
وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ ۔ (۳:۳۰)۔	اور وہی تو ہے جو آفرنیش کی ابتدا کرتا ہے۔ پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا۔ اور یہ اعادہ اس کے لئے سہل تر ہے۔
أَفَعَيِينَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ ۚ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ (۱:۵۰)	کیا ہم پہلی مرتبہ پیدا کرنے سے عاجز رہے تھے؟ (نہیں، ان کو پہلی آفرنیش سے انکار نہیں ہے) مگر ان کو ایک نئی آفرنیش میں شک ہے۔

اب صرف یہ شبہہ باقی رہ جاتا ہے کہ جن مردوں کے اجزاء جسم فنا ہو گئے ان کو پھر کیونکر پہلا جسم عطا کیا جا سکتا ہے، کوئی پانی میں ڈوب کر مرا اور اس کی بوٹی بوٹی مچھلیوں اور آبی جانوروں کی غذا بن گئی، کوئی جل کر مرا یا مر کر جلا دیا گیا، اور اس کا سارا جسم راکھ اور دھوئیں میں منتقل ہو گیا کوئی زمین میں دفن ہوا اور خاک میں رل مل گیا۔ اب کیونکر ممکن ہے کہ اس کا پہلا جسم عود کرے اور اس میں پھر وہی پہلی روح پھونکی جائے؟۔

اس شبہ کو لوگوں نے یہ کہہ کر دفع کرنے کی کوشش کی ہے کہ روح کو جسمانی زندگی عطا کرنے کے لئے لازم نہیں ہے کہ وہی پہلا جسم اس کو واپس دیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ روح وہی ہو اور اس کو پہلے جسم کے مشابہ کوئی دوسرا جسم عطا کر دیا جائے لیکن قرآن کہتا ہے کہ خدا وہی جسم عطا کرنے پر قادر ہے، پہلے جسم کے اجزا معدوم نہیں ہوتے ہیں منتشر حالت میں اس کا ہر جز کہیں نہ کہیں موجود ہے، خواہ ہوا میں ہو خواہ پانی میں ہو خواہ مٹی میں ہو خواہ نباتات یا حیوانات کے اجسام میں ہو، خواہ معدنیات کے اجرام میں ہو۔ خدا کا علم اتنا حاوی ہے کہ وہ ہر ہر جز کے مقام کو جانتا ہے اور اس کی قدرت اتنی کامل ہے کہ وہ ان منتشر اجزا کو پھر جمع کر کے پہلی صورت پر بنا سکتا ہے۔

قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ (۵۰:۱)

ہم کو معلوم ہے کہ زمین ان میں سے کیا چیز گھٹاتی ہے اور ہمارے پاس ایسی کتاب ہے جس میں ہر چیز کا ریکارڈ محفوظ ہے۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِىْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (۶:۷)

اور اس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کا علم اس کے سوا کسی کو نہیں ہے جو کچھ خشکی اور تری میں ہے اس کو سب معلوم ہے، ایک پتہ بھی اگر جھڑتا ہو تو وہ اس کو جانتا ہے، زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں ہے، اور کوئی خشک و تر چیز ایسی نہیں ہے جو واضح کر کے دکھا دینے والی ایک کتاب میں موجود نہ ہو۔

یہ جو کچھ بیان ہوا ہے اس کا مقصد اس استبعاد کو دور کرنا ہے جس کی بنا پر لوگ حیات اخروی سے انکار کرتے ہیں۔ انکار کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ منکرین کو کسی تجربہ یا مشاہدہ یا علم یقینی کے کسی اور ذریعہ سے قطعاً و یقیناً یہ معلوم ہو گیا ہے کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں بلکہ انکار صرف اس بنا پر ہے کہ مرنے کے بعد پھر جی اٹھنا ان کی عقل میں نہیں سماتا۔ انھوں نے اس نظارہ کو کبھی نہیں دیکھا۔ ان کو تو یہ دیکھنے کی عادت رہی ہے کہ

جو مرا سو پھر نہ پلٹا لہٰذا جب یہ کہا جاتا ہے کہ جو مرچکے ہیں وہ پھر پلٹیں گے تو اس خلاف عادت بات کو وہ محال، غیر ممکن، اور بعید از عقل وقیاس سمجھتے ہیں لیکن غور وفکر کی راہ میں ایک قدم آگے بڑھیے۔ یہ سارا استبعاد دور ہوجاتا ہے اور جو بات پہلے ناممکن نظر آتی تھی وہ عین ممکن نظر آنے لگتی ہے جن باتوں کو آپ ممکن بلکہ واقعی سمجھتے ہیں ان کے متعلق آپ کا ایسا سمجھنا محض اس وجہ سے ہے کہ آپ کو ان کے وقوع کا مشاہدہ کرنے کی عادت رہی ہے۔ ایک بیج کا زمین میں جاکر پھوٹنا اور ایک تناور درخت کی شکل میں نمودار ہونا، ایک قطرہ کا رحم میں پہنچنا اور وہاں سے ایک انسان کی شکل میں برآمد ہونا، دو ہواؤں کے مجموعے سے پانی بننا اور اس کا ایک ترتیب کے ساتھ بار بار پانی سے بھاپ اور بھاپ سے پانی بنتے رہنا، عالم کی اس وسیع فضا میں کروڑہا کروڑ سیاروں کا گیندوں کی طرح دوڑنا اور کسی مادی رشتے کے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ ایسا مربوط ہونا کہ اُن کی حرکات اور گردشوں کے نظم میں ذرہ برابر فرق نہ آئے، یہ سب باتیں دیکھنے کے آپ خوگر رہے ہیں اس لئے انکو معمولی سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر یہی چیزیں آپ کے سامنے پیش نہ ہوتیں اور اس کے بجائے کسی اور نظام سے آپ مانوس ہوتے، تو انہی سب باتوں کو آپ انتہا سے زیادہ بعید از عقل وقیاس سمجھتے، اور شدت کے ساتھ ان کے امکان سے انکار کرتے۔ فرض کیجئے کہ کرۂ مریخ میں درخت نہ اُگتے ہوں اور وہاں کے لوگوں سے بیان کیا جائے کہ ایک ماشہ بھر کا بیج زمین میں دفن ہوکر درخت بنتا ہے، اور اپنے ابتدائی حجم سے کئی ہزار بلکہ کئی لاکھ گنا بڑا ہوجاتا ہے، اور پھر اس میں سے ویسے ہی ہزاروں بیج پیدا ہوتے ہیں، تو یہ بات مریخ والوں کی نگاہ میں اتنی ہی حیرت انگیز ہوگی جتنی آپ کے نزدیک مرنے کے بعد پھر جی اٹھنے کی داستان حیرت انگیز ہے۔ وہ بھی اسی طرح کہیں گے کہ یہ تو ناممکن ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ عدم امکان کا فتویٰ علم کی بنا پر نہیں جہل کی بنا پر ہوگا، عقل کی رسائی کا نتیجہ نہیں نارسائی کا نتیجہ ہوگا۔ بس ایسا ہی حال آپ کے استبعاد کا ہے۔ اگر آپ اپنے استعجاب یا استبعاد کی حقیقت کو سمجھ لیں تو آپ کو خود معلوم ہوجائے گا کہ کسی چیز کا آپ کی عقل وقیاس سے دور ہونا درحقیقت اس چیز کے غیر ممکن یا محال ہونے کے لئے کوئی دلیل ہی نہیں ہے۔ جو چیزیں آج خود انسان ایجاد کررہا ہے وہ آج سے سو برس

پہلے خود انسان کے نزدیک بعید از عقل و قیاس تھیں۔ مگر واقعات سے ثابت ہو گیا کہ ناممکن نہ تھیں، اسی طرح جن چیزوں کو آج انسان مستبعد سمجھ رہا ہے، وہ آج سے سو دو سو برس بعد خود انسان کے ہاتھوں وجود میں آئیں گی اور واقعات ثابت کر دیں گے کہ وہ ناممکن نہیں ہیں۔ پھر جب انسان کی عقل اور اس سے بعید یا قریب ہونے کی حقیقت یہ ہو، تو کسی چیز کو محض اس بنا پر ناممکن نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس محدود عقل میں نہیں سماتی۔

کسی مخفی اور ماوراء حواس چیز کو ثابت کرنے کے لئے پہلا قدم یہی ہے کہ اس کا امکان ثابت کیا جائے چنانچہ قرآن مجید نے اپنے استدلال سے حیات اخروی کے استبعاد کو دور کر کے اس کو ممکن ثابت کر دیا اب دوسرا قدم یہ ہے کہ اس کی ضرورت ثابت کی جائے تاکہ عقل یہ تسلیم کرے کہ ایسی ایک چیز ضرور ہونی چاہئے اور اس کے عدم سے اس کا وجود اولیٰ ہے۔ (باقی)

مراۃ مثنوی

جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے رکن دار الترجمہ

مثنوی مولانا روم کا بہترین ایڈیشن جس میں مثنوی شریف کے منتشر مضامین کو ایک سلسلہ کے ساتھ اس طور پر مرتب کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا مولانا کے مدعا اور ان کی تعلیم کو بڑی آسانی سے سمجھتا چلا جاتا ہے کئی انڈکس اور فہرستیں بھی ہیں جنکی مدد سے آپ حسب منشا جو شعر چاہیں نکال سکتے ہیں۔ ایک بسیط فرہنگ بھی ملحق ہے۔ غرض یہ کہ اس کتاب نے مثنوی شریف سے فائدہ اٹھانے کے لئے سہولت مہیا کر دی ہے کہ ایک شخص بڑی آسانی سے کتاب کے مطالعہ پر عبور حاصل کر سکتا ہے

کاغذ کتابت طباعت بہترین جلد نہایت اعلیٰ قیمت عہ سکہ انگریزی۔ لعہ سکہ عثمانیہ۔

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجئے

کتب سماوی پر ایک نظر

(۶)

عہد جدید (اناجیل وغیرہم)

از جناب ذوقی شاہ صاحب

(سلسلۂ اشاعت ربیع الاول ۱۳۵۳ھ)

سرگذشت اناجیل بہرحال اناجیل اربعہ اور بقیہ کتب عہد جدید کسی کی بھی اصلی تصنیف ہوں اور کسی زمانہ میں بھی تصنیف ہوئی ہوں، الہامی ہوں خواہ مصنفین کی ذاتی تصانیف، ان کے مذہبی تقدس کے تسلیم ہونے اور ان کے قابل اعتماد ہونے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ اس بات کا کافی طور پر اطمینان کر لیا جائے کہ انکا اصلی اور ابتدائی وجود آج اپنی سچی صورت میں ہمارے سامنے باقی بھی ہے یا نہیں اور جو کتابیں آج ہمارے سامنے پیش کی جاتی ہیں وہ اپنی اصلی صورت میں قائم بھی ہیں یا نہیں۔ اس امر کی تحقیقات کے لئے ضرورت ہے کہ:-

(۱) قدیم نسخوں کو ٹٹولا جائے، انکی قدامت کا حال دریافت کیا جائے پھر اُن سے موجودہ مروجہ نسخوں کا مقابلہ کیا جائے۔

(۲) تراجم کی صحت یا عدم صحت پر تنقیدی نظر ڈالی جائے۔

(۳) بعض مصنفین قدیم نے اناجیل کے بعض مضامین کو اپنی تصانیف میں جگہ دی ہے جس سے عیسائی علماء اناجیل مروجہ کی قدامت وصحت پر دلیل لاتے ہیں چنانچہ اس دعوی پر بھی تحقیقی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

قدیم نسخے اس بات پر مسیحی علماء کا اتفاق ہے کہ انجیل کے جتنے اصلی نسخے تھے سب ضائع ہو چکے ہیں عیسیٰ علیہ السلام کی زبان عبرانی تھی۔ چنانچہ متی کی انجیل (باب ۲۷ آیہ ۴۶) میں جو فقرہ عیسیٰ علیہ السلام کی زبان کا نکلا ہوا

درج ہے کہ "ایلی ایلی لما سبقتانی" (یعنی اے میرے خدا اے میرے خدا تو نے کیوں مجھے چھوڑ دیا) وہ عبرانی زبان میں ہے۔ اسی سلسلہ کے مضمون نمبر ۴ میں تلایا جا چکا ہے کہ بکثرت عیسائی علما تسلیم کرتے ہیں کہ متی کی انجیل عبرانی زبان میں لکھی گئی تھی مگر آج وہ عبرانی نسخہ اس دنیا سے مفقود ہے اور اس کو غائب ہوئے بارہ سو برس سے زاید گذر چکے۔ اب یونانی زبان کے ترجمے ہی عہد جدید کی اصلی کتابیں سمجھی جاتی ہیں مگر ان قدیم یونانی نسخوں میں سے جو کہ تعداد میں بہت ہی کم ہیں کوئی نسخہ چوتھی صدی عیسوی سے پہلے کا نہیں بیان کیا جاتا اور ان کے چوتھی صدی کا ہونے میں بھی بہت کچھ اختلاف ہے۔ فرنسیس کرافورڈ برکٹ فاضل علوم دینیات و پروفیسر الہیات متعینہ کیمبرج یونیورسٹی انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا مطبوعہ ۱۹۲۹ء کی جلد ۳ میں زیر عنوان "بائبل" تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

"بہت عرصہ ہوا کہ عہد جدید کے اصلی قلمی نسخے ضائع ہو چکے ہیں باستثنار چند منتشر اجزا کے جو سب کے سب شمالی مصر سے دستیاب ہوئے۔ یہی حشر عیسائیوں کی بقیہ دیگر قدیم قلمی کتابوں کا بھی ہوا جب چوتھی صدی (عیسوی) میں حکومت عیسائی ہوگئی اور چرچ قائم ہوا تو نسخوں کی باقاعدہ نقلیں شروع ہوگئیں جنہیں کوڈیکس کہتے ہیں۔ چوتھی صدی کے اس قسم کے صرف دو کوڈیکس اب باقی ہیں اور ان میں جو کچھ درج ہے اُسی کو اس زمانہ میں پوری بائبل سمجھا جاتا تھا۔

ہارن صاحب اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ :۔

یونانی نسخے بہت کم ہیں جن میں عہد عتیق اور عہد جدید دونوں کی کتابیں موجود ہوں۔ اکثر میں صرف ۴ انجیلیں ہی پائی جاتی ہیں اور بعض نسخوں میں صرف حواریوں کے اعمال اور بعض میں اعمال اور پولوس کے نامے اور چند نسخوں میں صرف مشاہدات یوحنا۔ سب نسخے بالخصوص وہ جو زیادہ قدیم ہیں زمانہ کے دست مضرت سے یا غفلت سے ناقص ہوگئے ہیں۔ اِن نسخوں میں پہلے کے لکھے ہوئے کو مٹا کر اُس کی تصحیح کی ہے۔ بعض جگہ خوب نہیں مٹایا کیونکہ نسخہ اصلی لکھا ہوا بھی معلوم ہوتا ہے۔ اصلی لکھے ہوئے کو بعد کی تصحیح پر ترجیح

دی جاتی ہے پہلے لکھے ہوئے کو کہیں تو اسطرح مٹایا ہے کہ الفاظ پر خط کھینچ دیا گیا ہے کہیں چاقو سے چھیلا ہے کہیں اسفنج سے پونچھ دیا گیا ہے اور اس جگہ دوسرے الفاظ لکھدئے گئے ہیں اسطرح کا مٹانا چند حروف یا الفاظ تک محدود نہیں بلکہ کوڈیکس بیزی اور دیگر کتب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسطرح پوری کتابیں کی کتابیں صاف کر کے ان پر دوسری کتابیں لکھدی گئی ہیں ۔جہاں بسبب زمانہ دراز کے کوئی تحریر اوڑجاتی اُس کو اسی طرح رہنے دیتے اور بغیر زیادہ مٹانے کے اُسی پر دوسری تحریر لکھدیتے + + ++ + ++ مدت تک یہ خیال رہا کہ یہ روش گیارہویں بارہویں تیرہویں اور چودھویں صدی تک رہی اور یونان میں بالتخصیص جاری رہی مگر حقیقت یہ ہے کہ وحشت اور جہالت کی یہ قباحت زیادہ عرصہ تک قائم رہی اور رومیوں میں بھی پھیلی رہی ۔"

فن طباعت کی ایجاد سے قبل اور کاغذ کے وجود میں آنے اور ارزاں ہونے سے پیشتر کتابوں کی اشاعت میں جو دقتیں پیش آتی تھیں اُنکا ذکر اسی سلسلہ کے مضمون نمبر ا میں آچکا ہے ۔اسی مضمون میں سرگذشت توریت کے زیرعنوان توریت کی جو آٹھ تباہیاں بیان کی گئی ہیں ۔ان میں سے آخری پانچ بربادیوں میں جو کہ ولادت مسیح کے بعد واقع ہوئیں اناجیل اور بقیہ کتب عہد جدید بھی شامل ہیں ۔حفاظ کے وجود کا نہ ہونا جو یہودیوں کی خامی کا باعث تھا ۔عیسائیوں کی بھی خامی کا باعث رہا ۔اس پر طرّہ یہ ہوا کہ بعض پادریوں کے علاوہ کسی کو اپنے پاس انجیل رکھنے کی اجازت نہ تھی ۔عوام الناس کو اس زمانہ میں انجیل پڑھنے تک کی ممانعت تھی ۔ سنہ ۱۵۲۴ء میں شہر لیزرک میں ایک کتب فروش جس کا نام ہرگاٹ تھا صرف اس جرم پر قتل کر دیا گیا کہ اُس نے ایک انجیل فروخت کی تھی ۔اسی جرم میں ایک دوسرے کتب فروش کی آنکھیں نکالی گئیں تھیں ۔مارٹن لوتھر کے زمانہ سے انجیلوں کو شہرت ہوئی ہے مگر طباعت کی ایجاد کے بعد بھی کچھ عرصہ تک انجیلیں بہت گراں رہیں ۔ ہندی تواریخ کلیسا کے صفحہ ۲۲۱ پر لکھا ہے کہ فرانس میں جو انجیل کہ پانچسو روپیہ (۵۰۰) میں فروخت ہوتی تھی وہ ایجاد

طباعت کے بعد بھی وہاں ایک سو بیس سے کم میں دستیاب نہ ہوتی تھی۔ پھر ایک عیسائی تصنیف مرأت الصدق (صفحہ ۴۸۔۴۹) کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نوع کے واقعات بھی پیش آتے رہے ہیں پراٹسٹنٹ عیسائیوں نے رومن کیتھولک عیسائیوں کی عداوت میں وہ تمام کتب خانے غارت کر دیے جن کا ذکر جی۔ بیل رورو کر کرتا ہے۔ اُن کتابوں کو غرق کیا۔ اُن کے اوراق سے اپنے شمعدان اور جوتے صاف کئے۔ دوکانداروں اور صابون بیچنے والوں کے ہاتھ انہیں فروخت کیا کہ وہ اُن سے پڑیاں بنائیں۔ سمندر پار کے جلد سازوں کے ہاتھ اُن کتابوں کو فروخت کیا اور وہ بھی کچھ سَو پچاس کی تعداد میں نہیں بلکہ جہاز کے جہاز لاد کر۔ مذہبی کتابیں عداوت باہمی کی بنا پر اس کثیر تعداد میں برباد ہوئیں کہ غیر اقوام کے لوگوں کو تعجب آتا تھا۔ اس نوع کے واقعات کا نتیجہ ہوا کہ اصلی کتابیں برباد ہوگئیں اور نقلی اور جعلی کتابوں نے اُن کی جگہ لے لی۔ ممکن ہے کہ ان جعلی کتابوں میں سب جھوٹ ہو یا کچھ سچ ہو اور کچھ جھوٹ۔ دونوں صورتوں میں وہ محققین کی نگاہ سے گرگئیں اور آج یورپ میں عیسائی جماعتوں ہی کے لوگ ان پر نکتہ چینیاں کرتے ہیں اور انہیں ساقط الاعتبار سمجھتے ہیں۔

قدیم عیسائی محققین نے اپنے زمانہ کے اُن قلمی نسخوں کو جو اصلی نسخوں کی نقلیں بیان کئے جاتے تھے کوشش بلیغ سے عبارات کا مقابلہ کرکے متعدد اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ ڈاکٹر گریس باخ (گریس بک) کے وضع کردہ قوانین کے مطابق عہد جدید کے یونانی نسخے تین اقسام میں تقسیم کئے گئے ہیں۔

(۱) پہلی قسم الیگزنڈرین ہے جس کو مصری نسخہ بھی کہتے ہیں۔ اس قسم میں وہ تمام قلمی نسخے داخل ہیں جن کی مشہور عبارتیں الیگزنڈریہ (اسکندریہ) کے مورخین و مصنفین کی اُن عبارات سے مطابقت رکھتی ہیں جو اُن لوگوں نے اپنی کتابوں میں نقل کی ہیں۔ اِن مصنفین میں اوریجن اور کلیمنٹ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں مصنفین کے بعد مصریوں اور یونانیوں نے اسی نسخہ کو اختیار کرلیا۔

(۲) دوسری قسم آکسی ڈنٹل یا ویسٹرن یعنی مغربی نسخہ کی قرار دی جاتی ہے۔ اس قسم کے نسخے افریقیہ اٹلی اور مغربی یورپ میں مروج ہوگئے۔

۳۔ تیسری قسم بائیزن ٹائین یا اورینٹل یعنی مشرقی نسخہ کی ہے۔ پانچویں اور چھٹی صدی کے درمیان محققین کے ہاتھ ایک ایسا نسخہ آگیا جو متذکرہ بالا دونوں نسخوں سے مختلف تھا۔ یہ نسخہ قسطنطنیہ میں مقبول ہوگیا قسطنطنیہ کو اُس زمانہ میں بائیزن ٹائین کہتے تھے اور وہ پوپ کا پائے تخت تھا۔ چنانچہ قرب وجوار کے صوبے اور ممالک اور وہ تمام لوگ جو قسطنطنیہ کے پوپ کے روحانی تسلط کے مطیع تھے بائیزن ٹائین نسخہ کے بھی مطیع ہوگئے اس نسخہ کی عبارتیں یونانی ولگٹ کے نسخہ سے بہت مطابقت رکھتی ہیں۔ مسٹر میکیلس نے بائیزن ٹائین نسخہ کو قدیم وجدید کی تفریق سے بھی منقسم کیا ہے مگر کوئی قاعدہ مقرر نہیں جس کی رو سے ہم قدیم وجدید میں تمیز کرسکیں۔

متذکرہ بالا تین اقسام پر مسٹر میکیلس نے ایک چوتھی قسم کا اضافہ کیا ہے جسے وہ اڈیسن نسخہ پیکیٹو یا پرانا سُریانی زبان کا ترجمہ عہد جدید قرار دیتے ہیں۔ اس نسخہ میں متذکرہ بالا تینوں نسخوں سے بہت اختلافات ہیں۔

بعض پادریوں نے زمانہ کے اعتبار سے ان نسخوں کی ترتیب کی ہے مثلاً پروفیسر ہگ نے اور بعض نے دیگر اعتبارات سے انہیں تقسیم کیا ہے۔ مقصد ان تقسیمات وتحقیقات کا یہ تھا کہ اصلی اور غیر اصلی نسخوں میں امتیاز پیدا ہوسکے اور صحیح عبارات کو غلط عبارات سے تمیز کیا جاسکے مگر اس میں ناکامی رہی۔ اور پیچیدگیاں روز بروز بڑھتی گئیں۔ ہارن صاحب بالآخر تنگ آکر لکھتے ہیں کہ اب کسی نسخہ میں مصنف کی ساری عبارت درج نہیں بلکہ تمام جہان کے نسخوں میں وہ پھیلی ہوی ہے۔ بینٹلی صاحب لکھتے ہیں کہ مصنفوں کے اصلی نوشتے اب موجود نہیں ہیں۔ اس لئے ان کے تمام اصلی الفاظ کسی ایک نقل میں نہیں ملتے لیکن جملہ نقول کے مقابلہ سے دریافت ہوتے ہیں۔ پادری فانڈر صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

"اب درآنحالیکہ اصل نسخہ موجود نہ رہا اور قدیم کتابوں کا شاید ایک بھی اصل نسخہ ابتک باقی نہ رہا ہو، پس ان غلطیوں کے تصحیح کرنے کی کوئی اور راہ اور تدبیر نہیں ہے مگر یہ کہ اس کی سب نقلیں نزدیک و دور سے جمع کریں اور عالم وفاضل زباندان اُن سب کو مقابلہ کرکے اس راہ سے تصحیح کریں اور جتنے نسخے زیادہ ہوں تصحیح

بھی اتنی ہی آسان ہوگی"

(اختتام دینی مباحثہ)

ہم یہہ کہتے ہیں کہ مقابلہ کے لئے نسخے خواہ کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں جب اصلی نسخہ کا وجود ہی مفقود ہے تو یہ ظنی تصیحات کیونکر معتبر ہو سکتی ہیں۔

کوڈیکس اب ذرا اُن قدیم قلمی نسخوں پر بھی نظر ڈال لینے کی ضرورت ہے جنہیں کوڈیکس کہتے ہیں۔ اور جن کی قدامت کے زعم پر پادری عوام کے سامنے اناجیل مروجہ کی صحت و صداقت کا بڑے زور و شور سے دعوٰی کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل حالات بیشتر ہارن صاحب کے انٹروڈکشن سے ماخوذ ہیں:۔

(۱) کوڈیکس الیکزینڈرین یعنی نسخہ سکندریہ۔ اس نسخہ کو ۱۶۲۳ء میں قسطنطنیہ کے لاٹ پادری نے چارلس اول شاہ انگلستان کو نذر کیا۔ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ عیسائی علمار مصححین بائبل نے قدامت کے لحاظ سے اسی نسخہ کو اول درجہ میں رکھا ہے۔ یہ چار جلدوں میں ہے تین جلدوں میں عہد عتیق کی جھوٹی سچی ساری کتابیں شامل ہیں اور چوتھی جلد میں عہد جدید کی کتابیں۔ اس جلد میں کلیمنٹ کا نامہ اول بنام کارنتھینز اور زبور سلیمان بھی درج ہیں جنہیں عیسائی اب جعلی قرار دیتے ہیں۔ عہد جدید کی کتابوں میں سے متی کی انجیل ابتدا سے باب ۲۵ آیہ ۶ تک اور یوحنا کی انجیل باب ۶ آیہ ۵۰ سے باب ۸ آیہ ۵۲ تک اور نامۂ دوم قرنتیون کو باب ۴ آیہ ۱۳ سے باب ۱۲ آیہ ۷ تک غائب ہے۔ زبور سے پہلے اتھانی سیس کا ایک نامہ بنام مارسلینس زائد ہے اور اس کے بعد ایک فہرست ان زبوروں کی بھی درج ہے جو رات دن کے ہر گھنٹہ کی نمازیں استعمال کی جائیں۔ چند گیت بھی اس فہرست میں درج ہیں جن میں سے گیارہواں گیت حضرت مریم کی تعریف میں ہے۔ بعض عیسائی عالموں نے اس نسخہ کی بہت تعریف کی ہے اور بعض نے انتہا درجہ کی مذمت۔ اس میں بھی اختلاف ہے کہ یہ نسخہ کسنے لکھا، کب لکھا، اور کہاں لکھا گیا۔ گریب اور اسکا پیرا سے اختتام صدی چہارم سے قبل بتلاتے ہیں۔ وٹسٹین پانچویں صدی کا، ڈاکٹر سیمبلر ساتویں صدی کا، سکیلس آٹھویں صدی کا، اور اُن

دسویں صدی کا بتلاتے ہیں۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دسویں صدی صدی عیسوی میں یورپ انتہا درجہ کی تاریکی اور جہالت میں غرق تھا اور نفسانیت جھوٹ دغا فریب اور جعل سازی کی گرم بازاری تھی۔

۲۔ کوڈیکس واٹیکن یعنی پوپ کے محل (روم) والا نسخہ۔ عیسائی علماء کے نزدیک اس کا دوسرا نمبر ہے رومی ترجمہ سیپٹو اجنٹ (مطبوعہ ۱۵۹۰ء) میں اس نسخہ کا متن ہے اور رومی نسخہ کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ۔ یہ نسخہ ۳۸۷ء سے قبل یعنی چوتھی صدی کے آخر کا لکھا ہوا ہے۔ پروفیسر ہگ کا خیال ہے کہ یہ چوتھی صدی کی ابتدا کا ہے بشپ مارش پانچویں صدی کے آخر کا تبلاتے ہیں مونت فاکن اور بلین کا ین پانچویں یا چھٹی صدی کا کہتے ہیں۔ اور دیوین صاحب زور دیتے ہیں کہ یہ ساتویں صدی عیسوی کا ہے مونت فاکن تو اس امر پر بھی بہت زور دیتے ہیں کہ ایک بھی یونانی نسخہ چھٹی صدی عیسوی سے قبل کا لکھا ہوا نہیں ہے، نہ کوڈیکس الیکزنڈرین اور نہ کوڈیکس واٹیکن۔ اور یہ دونوں نسخے عیسائیوں کے نزدیک موجودہ تمام نسخوں میں قدیم ترین ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضور سرور کائنات محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کے زمانہ میں اس زمانہ کے اہل کتاب کے پاس توریت وانجیل کے جو نسخے تھے وہ بھی اب غائب ہیں اور قرآن شریف میں توریت وانجیل کے جو حوالجات آئے ہیں ان کا ان کتابوں پر صادق آنا لازمی نہیں جو آجکل توریت وانجیل کے نام سے مشہور ہیں۔ اس پہلو پر تفصیلی بحث انشاء اللہ کسی دوسرے موقع پر کی جائے گی۔

کوڈیکس واٹیکن کے حصہ عہد عتیق سے کتاب پیدائش کے چھیالیس ابواب (از باب اول تا باب چھیالیس) اور زبور کے تیئیس ابواب (از باب ۱۰۵ تا ۱۳۷) غائب ہیں۔ عہد جدید میں عبرانیوں کے باب ۹ آیہ ۱۴ سے آخر نامہ تک اور دو نامے بنام تمتاؤس اور نامجات بنام طیطس اور فلیمان اور مشاہدات یوحنا کی پوری کتاب غائب ہے مگر پندرھویں صدی میں کسی نے مشاہدات اور آخر نامہ عبرانیاں لکھکر کوڈیکس میں

شامل کر دیا ہے۔ اس نسخہ میں کاٹ چھانٹ بہت ہے۔ بہت جگہ چھیلا گیا ہے۔ پھر درست کیا گیا ہے۔ یہ کوڈکس جس لاطینی ترجمہ (یعنی سیپٹو اجنٹ) کی نقل ہے اُس کے متعلق وارڈ صاحب اپنی کتاب غلطنامہ مطبوعہ سنہ ۱۸۴۱ء کے صفحہ ۱۸ پر لکھتے ہیں کہ مشرق کے ملحدوں نے اس میں تحریفیں کی ہیں۔ ہارن صاحب لکھتے ہیں کہ۔

"یہ بات ضرور یاد رکھی جائے کہ کوئی ترجمہ مثل ترجمہ لاطینی کے خراب نہیں کیا گیا۔ اس کے نقل کرنے والوں نے بہت ناجائز خود سری سے عہد جدید کی ایک کتاب میں دوسری کتاب کے فقرے داخل کر دیے اور حاشیہ کی عبارت کو متن میں درج کر دیا ہے۔"

باوجود اس اہمیت کے جو مذکورہ بالا دونوں کوڈیکسوں کو دی جاتی ہے، تعجب ہے کہ ان دونوں میں اس درجہ اختلاف ہے کہ ایک نام کی دو کتابوں میں ایسا اختلاف کہیں نظر نہیں آتا۔ ہارن صاحب لکھتے ہیں کہ جہان میں کسی کتاب کے دو نسخے ایسے مختلف نہیں جیسے کہ کوڈکس الیگزنڈرین اور کوڈیکس واٹیکن ہیں پادری فانڈر صاحب اور دیگر عیسائی محققین کو بھی یہ شکایت ہے۔ جب اہم ترین نسخوں کا یہ حال ہے تو کم تر نسخوں کے ذکر سے کاغذ کو رنگین کرنا لاحاصل ہے تاہم اطمینان مزید کے لئے چند دیگر کوڈیکسوں پر بھی نظر ڈالی جاتی ہے۔

۳۔ کوڈیکس سیناٹیکس یعنی نسخہ سینا۔ اس نسخہ کی آج کل خوب دھوم مچ رہی ہے اور انگلستان نے اسے جدید اہمیت دے رکھی ہے اس کی داستان بھی عجیب ہے۔ جرمنی کا ایک مشہور عالم ڈاکٹر ٹشنڈرف سنہ ۱۸۴۴ء میں مونٹ سینائی یعنی کوہ طور کی ایک مشہور عیسوی خانقاہ سینٹ کیتھرین کے کتب خانہ کی سیر کر رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ خدام خانقاہ آگ روشن کرنے کے لئے قلمی اوراق کا ڈھیر ایک ٹوکرے میں لائے ہیں۔ ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر چند اوراق ٹوکرے سے نکال کر دیکھے تو معلوم ہوا کہ یہ تو بائبل یعنی یونانی نسخہ سبعینیہ کی کوئی پرانی نقل ہے۔ بیتاب ہوگیا کیونکہ نسخہائے قدیم کا وہ دلدادہ تھا۔ فوراً راہبوں سے درخواست کر کے چالیس اوراق ٹوکری میں سے اُس نے اور نکال لئے اس کے انداز بیتابانہ کو دیکھ کر راہب سمجھ گئے کہ ٹوکرے میں اوراق کا یہ ڈھیر جو

آگ میں جھونکے جانے کے لئے آیا ہے غالباً کوئی قیمتی چیز ہے اور کیا عجب کہ کسی موقعہ پر افزونی دولت کا باعث ہو۔ انہوں نے اس ٹوکرے کو اٹھاکر حفاظت سے رکھ لیا اور ڈاکٹر کی مزید درخواست پر اسے مزید اوراق دینے سے انکار کردیا۔ ڈاکٹر نے جرمنی پہنچکر اوراق بقیہ کے حصول وتحفظ کی کوشش شروع کردی۔ پندرہ برس کی مسلسل کوشش کے بعد وہ زار روس کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہوا اور ۱۸۵۹ء میں، وہ پھر اس خانقاہ میں آیا۔ اس مرتبہ شاہی سفیر کی حیثیت سے آیا۔ بڑی کوشش اور بڑی مشکل سے کامل نسخہ کی تلاش کرکے راہبوں کو رضامند کیا اور نسخہ اپنے ہمراہ لیکر روس کے پایۂ تخت میں آیا۔ یہ نسخہ وہاں کے شاہی کتب خانہ میں رہا۔ مگر سال گذشتہ بالشویکس نے اس نسخہ کو ایک لاکھ پونڈ قیمت پر حکومت انگلستان کے ہاتھ فروخت کردیا اس قیمت کا نصف حکومت اپنے پاس سے ادا کریگی اور نصف رعایا سے چندہ لیا جائیگا۔ برٹش میوزیم میں اب یہ نسخہ آگیا ہے اور چونکہ لوگوں سے ابھی روپیہ وصول کرنا باقی ہے اس لئے اس کی قدامت اور تعریف کے اشتہارات کا آج کل زور ہے۔ ٹائمس آف انڈیا کا بیان ہے کہ اس کوڈیکس میں عہد عتیق کی کتابوں کا بڑا حصہ ہے جو کہ یونانی زبان میں ہے نہ کہ عبرانی میں لیکن عہد جدید کی پوری کتابیں ہیں جنمیں انجیل برنباس اور "دی شیپرڈ آف ہرمس" بھی شامل ہیں۔ اسی ٹائمس آف انڈیا کی اشاعت مورخہ ۱۶ فروری ۱۹۳۴ء کے دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کے بعض حلقوں میں اس کوڈیکس پر آوازے بھی کسے جارہے ہیں اور بیان کیا جارہا ہے کہ یہ کتاب جعلی ہے اور کانسٹنٹائن سائمونائیڈز کا تیار کیا ہوا یہ جعل اور اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ کتاب ہے۔ یہ شخص یونان کا رہنے والا اور انیسویں صدی کا مشہور جعلساز تھا۔ اس کا پیشہ ہی جعلسازی تھا۔ صورت سے اس کے وجاہت ٹپکتی تھی۔ ماتھا اس کا بہت چوڑا تھا۔ قدیم قلمی تحریروں کے متعلق معلومات میں اور ان کی نقل کرنے کے فن میں دنیا میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا۔ ہزاروں قلمی نسخے اس کے قبضہ میں تھے جو اس نے مختلف عیسائی خانقاہوں سے حاصل کئے تھے۔ ان قلمی نسخوں کے ذریعہ وہ لوگوں کو دھوکا دیتا تھا اور انھیں اپنا گرویدہ بناکر اپنے ہاتھ کی جعلی تحریروں کو بڑی بڑی قیمتوں پر ان کے ہاتھ فروخت کرتا تھا۔ ایک موقع پر وہ لیپزگ

میں گرفتار بھی ہو چکا تھا۔ اور برلن میں اوس پر مقدمہ چلا تھا مگر جرم ثابت نہ ہو سکا اور عدالت مجبور ہو گئی کہ اسے چھوڑ دے۔ اس کے بعد اُس نے بڑے پیمانہ پر سیاحت شروع کر دی اور بڑے بڑے کتب خانوں کی اس نے سیر کی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک موقعہ پر وہ خود اعتراف کر چکا ہے کہ کوڈیکس سینا ئیٹیکس میری ہی کاریگری کا نمونہ ہے۔

۴۔ کوڈیکس ایمبروسینیس۔ ساتویں صدی کا لکھا ہوا بیان کیا جاتا ہے۔ انداز عبارت شہادت دیتا ہے کہ زمانہ مابعد کے کسی شخص نے اس میں کچھ اضافہ کیا ہے۔

۵۔ کوڈیکس افرمی یا کوڈیکس رجی آس۔ یہ نسخہ مصر میں لکھا گیا۔ عہد جدید کے بہت سے مقامات سے عبارت اُڑی ہوئی ہے بشپ مارش کی تحقیقات کی رو سے ساتویں صدی کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

۶۔ کوڈیکس بیزی۔ اس میں چار انجیلیں اور اعمال کی کتاب ہے۔ چھیاسٹھ (۶۶) ورق اس میں بہت پھٹے ہوئے اور خراب ہیں۔ دس ورق کسی نے بعد میں لکھکر لگائے ہیں۔ متی کے پہلے باب کی بیس آیتیں غائب ہیں۔ زمانہ تحریر میں اختلاف ہے۔ بعض دوسری صدی، بعض پانچویں، بعض چھٹی، اور بعض ساتویں کا لکھا ہوا نسخہ بیان کرتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر گریسباخ اسے بارہویں صدی کا لکھا ہوا بیان کرتے ہیں۔ اس نسخہ میں وقتاً فوقتاً اصلاحیں ہوتی رہی ہیں جن پر تفصیلی بحث گریسباخ نے کی ہے۔ کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں یہ نسخہ موجود ہے

(۷) کوڈیکس کارس وانسس۔ بارہویں صدی کا لکھا ہوا نسخہ ہے۔ عہد جدید کی کتابوں پر مشتمل ہے یہ استثنا مشاہدات یوحنا جس نسخہ سے اسے نقل کیا گیا ہے اس کے حاشیہ پر جو عبارت بطور شرح کے لکھی تھی وہ اس نقل میں متن کے ساتھ شامل کر دی گئی ہے۔

اس سے زاید کوڈیکسوں اور پرانے قلمی نسخوں کے حالات دریافت طلب ہوں تو ڈاکٹر گریسباخ اور میکالس کی کتابوں کو ملاحظہ فرمائیے۔

اختلافات مابعد | قدیم نسخوں کی جب یہ کیفیت ہے تو بقول مابعد کا اختلافات سے محفوظ رہنا کیونکر ممکن تھا

میں آسکتا ہے۔ جرمنی کے مشہور ڈاکٹر مل نے عہد جدید کے چند نسخے جمع کر کے مقابلہ کیا تو عبارت میں تیس ہزار اختلافات نکلے۔ جان جمیس و ٹیطسطین نے مختلف ممالک میں پھر کر بہت بڑی تعداد میں نسخوں کا مقابلہ کیا تو دس لاکھ اختلافات پائے۔ ان میں سے کثرت اختلافات تو ایسے ہیں جنھیں قرات اور کتابت کا اختلاف کہہ سکتے ہیں لیکن ایسے اختلافات بھی کچھ کم نہیں ہیں جن سے معنی میں بڑا فرق واقع ہوجاتا ہے۔ ان اختلافات کا ہونا لازمی تھا۔ بقول ہارن صاحب کے وجوہ اختلافات حسب ذیل ہیں۔

۱- ان نسخوں میں غلطیوں کا ہونا جن سے نقلیں کی جاتی تھیں۔

۲- ناقلوں کی غفلت، غلطیاں اور جہالت، ناسمجھی کی بنا پر کبھی اصلی نسخے کے علامات و اشارات کو نہ سمجھنا۔ کبھی متن اور حاشیہ پر کی شرح میں امتیاز نہ کرنا اور انہیں خلط ملط کر دینا۔

۳- کبھی بظاہر اختلافی عبارت کو تطبیق دینے کی غرض سے کبھی کسی اعتراض کے دفع کرنے کی نیت سے، کبھی اپنے نزدیک اصلاح کی ضرورت سمجھکر کبھی عبارت میں حسن مزید پیدا کرنے کی کوشش میں اپنی طرف سے نقلوں میں تصرف کرنا اور عبارت کو تبدیل کر دینا۔

۴- کبھی اپنے مذہبی فرقے کی تائید میں جھوٹ سے مدد لینے کو ثواب سمجھکر عبارات کو تبدیل کر دینا اور اپنے مطلب کا بنا لینا۔

ترجموں کی کیفیت ترجموں کی صحت و عدم صحت پر جداگانہ عنوان کے تحت میں بحث کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ جتنی خرابیاں بیان کی گئی ہیں۔ وہ سب ترجموں ہی سے متعلق ہیں۔ اصلی زبان میں تو بائبل کا وجود ہی نہیں رہا۔ یہ جو کچھ نظر آرہا ہے اصل کے نہ ہونے اور ترجموں پر دین کا دار و مدار ہوجانے ہی کا نتیجہ ہے۔ تاہم اگر ترجمہ در ترجمہ کی غلطیوں کی بھی فہرست پیش کرنے کا قصد کیا جائے تو اس کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہوگی۔

مصنفین قدیم کی شہادت علماء عیسوی کا دعوی ہے کہ مصنفین قدیم مثلاً کلیمنس وغیرہ اپنی تصانیف میں اناجیل کے بعض فقرات درج کرتے ہیں جس سے اناجیل مروجہ کی صداقت کا اظہار ہوتا ہے۔ ہم سر دست کلیمنس کی تصا

ایک مثال کو لے کر دیکھتے ہیں کہ عیسائیوں کا یہ دعویٰ کہاں تک صحیح ہے۔ کیونکہ اس ایک مثال سے بقیہ مثالوں پر بھی روشنی پڑے گی، بوجہ اس کے کہ وہ ساری مثالیں تقریباً یکساں ہیں۔

کلیمنس کو روم کا اسقف بیان کرتے ہیں۔ اُس نے ایک خط فرنتیوں کے نام لکھا تھا جس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ "جو عیسیٰ کو پیار کرتا ہے اس کو چاہئے کہ اُس کے حکم پر عمل کرے" مسٹر جونس کہتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ کلیمنس نے یوحنا باب ۱۴ آیہ ۱۵ کے حوالہ سے یہ فقرہ لکھا ہے۔ اول تو یہاں مطابقت پوری نہیں۔ دوسرے حوالہ کا کوئی قرینہ نہیں۔ اگر قدرے مطابقت معنی کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو سب سے پہلے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا واقعی کلیمنس نے فرنتیوں کے نام کوئی خط بھیجا بھی تھا یا یہ سب فرضی واقعہ ہے۔ اگر بھیجا تھا تو اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ خط اپنی اصلی صورت میں آج بھی موجود ہے اور یہ فقرہ اُس میں بعد کا الحاق نہیں۔ جب اناجیل تک میں الحاق ہو گیا تو ایک معمولی اسقف کے خط میں الحاق کا ہو جانا کونسی بڑی بات ہے۔ بعد اُس کے یہ دیکھنا چاہئے کہ خط کی تاریخ کیا ہے۔ اس کی تاریخ کے متعلق اختلاف ہے۔ سنہ ۶۴ء بھی بیان کیا جاتا ہے اور سنہ ۷۰ء اور سنہ ۹۱ء بھی اور سنہ ۹۵ء بھی۔ بہرحال کلیمنس کے خط کے سال تحریر نے سنہ ۹۵ء سے تجاوز نہیں کیا۔ اور تفسیر ہارن صاحب کی رو سے مسٹر جونس ہی کا یہ قول ہے کہ یوحنا نے اپنی انجیل سنہ ۹۸ء میں لکھی۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کلیمنس کے خط لکھنے کے وقت یوحنا کی انجیل کا وجود ہی کہاں تھا کہ اُس کے حوالہ سے کوئی عبارت اس خط میں لکھی جاتی۔ چنانچہ اسی بنا پر بشپ پترس صاف اقرار کرتے ہیں کہ کلیمنس نے یہ فقرہ انجیل سے نہیں لکھا۔ اگر تحریر خط کے زمانہ میں اس انجیل کا وجود ہونا بھی، تب بھی اس نوع کی مطابقت سے یہ لازم نہ آتا کہ وہ فقرہ انجیل سے لیا گیا ہے۔ صاحب اکسیہومو لکھتے ہیں کہ وہ عمدہ اخلاق مندرجہ عہد جدید جن پر عیسائی بڑا فخر کرتے ہیں لفظاً لفظاً کنفیوشس کی کتاب اخلاق سے جو قریب چھ سو برس قبل مسیح تصنیف ہوئی منقول ہیں۔ مثلاً اخلاق ۲۴ کے ذیل میں یوں مرقوم ہے کہ "دوسرے سے وہ کرو جو تم چاہتے ہو کہ وہ تم سے کرے اور نہ کرو وہ جو تم نہیں چاہتے کہ وہ تم سے کرے اور تم کو صرف اسی خُلق کی حاجت ہے اور یہ سب خلقوں کی اصل ہے"۔ اب یہی مضمون متی باب ۲۲ آیہ ۳۹ و ۴۰ میں بھی درج ہے

جو عیسائیوں میں نہایت عالی اور گولڈن رول اور اصول زرین سمجھا جاتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ انجیل کا یہ مضمون کنفیوشس سے ماخوذ ہے تو عیسائیوں کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟ انجیلوں میں اور بھی بہت سے مضامین ہیں جن کے مقابلہ میں ہم معنی مضامین اُن کتابوں سے پیش کئے جا سکتے ہیں جو ولادت مسیح کے قبل سے اپنا وجود رکھتی ہیں۔ اگر یہ کہدیا جائے کہ انجیلوں کے یہ سارے مضامین ان کتابوں سے ماخوذ ہیں تو عیسائی حضرات کو بڑی مشکل کا سامنا پیش آئے گا۔ کیونکہ وہ خود اسی نوع کے دلائل پیش کرنے کے عادی ہو رہے ہیں۔ توارد یا مطابقت مضامین سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایک مصنف دوسرے مصنف کے ان تحریر کردہ مضامین سے آگاہ تک ہو۔

اس بارہ میں عیسائی علماء کے جملہ استدلالات اسی نوع کے ہیں چنانچہ ان سب کو اسی پر قیاس کر لینا چاہیئے۔ (باقی)

اعجاز القرآن

یہ ایک بہت ہی نایاب رسالہ ہے علی بن عیسیٰ الرمانی اس کا مصنف ہے۔ (المتوفی ۳۸۴ھ) اب تک اس کے ایک ہی نسخہ کا پتہ چلا تھا جو قسطنطنیہ کے کتب خانہ میں تھا۔ ڈاکٹر عبد العلیم صاحب ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی نے اپنے قیام جرمنی کے زمانے میں بڑی دقتوں سے اپنے ایک پروفیسر کے ذریعہ اس کا فوٹو منگوایا اور اب مقام شکر ہے کہ مکتبہ جامعہ نے یہ قیمتی کتاب شایع کر دی ہے اور گویا اسے زمانے کی دستبرد سے محفوظ کر لیا ہے۔ کتاب عربی میں ہے اور اس میں قرآن کی فصاحت و بلاغت اور اعجاز کے متعلق عجیب و غریب نکتے بیان کئے گئے ہیں۔ مکتبہ نے اسے نہایت اہتمام سے بہترین کاغذ پر ٹائپ میں شایع کیا ہے قیمت صرف ۸؍

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ - دہلی۔

قرآن کی دولت

از جناب مولانا عبد اللہ العمادی

در آشیان ما پرو بال ہما رسید
ہر جا رسید سایۂ دولت زما رسید

(۱)

قرآن کریم ایک لازوال خزینہ ہے، ایک لافنا گنجینہ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس خزانہ عامرہ سے ہم کیونکر فائدہ اٹھائیں، کیا صورت ہو کہ یہ گنج شایگاں ہمارے حق میں رایگاں نہ رہے؟ اس سوال کا جواب ہم کو دینے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ قرآن کریم خود اس کے جواب کا اعلان کر چکا ہے۔ سورۂ ص میں ہے۔

کِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوْا اٰيَاتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (سورہ ۳۸ رکوع ۳ آیت ۲۸)

برکت والی کتاب ہم نے تمہاری طرف اس غرض سے اتاری ہے کہ لوگ اس کی آیتوں میں تدبر و تفکر کریں اور جو عقل رکھتے ہیں اس سے نصیحت پکڑیں۔

سورۂ زمر میں ہے۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ۔ (سورہ ۳۹۔ رکوع ۳۔ آیت ۲۹)

ہم نے لوگوں کے لئے اس قرآن میں سب ہی طرح کی مثالیں دی ہیں کہ شاید لوگ نصیحت پکڑیں۔ ایسا فصیح قرآن جس میں کسی طرح کی پیچیدگی نہیں شاید یہ لوگ اس سے متقی بنیں۔

کیا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نزول قرآن کی غرض یہی تھی کہ لوگ اس کو پڑھیں، اس کی تعلیمات کا

مفہوم سمجھیں۔ اُن میں غور کریں نصیحت پذیر ہوں۔ اور تقوی سے جو تہذیب اخلاق وتزکیۂ نفس کا انتہائی درجہ ہے، اپنے آپ کو اپنی قوم کو، اپنی قومی معاشرت کو آراستہ بنائیں؟

تمکو بارہا تعجب ہوا ہوگا کہ مسلمان پہلے بھی تھے اور اب بھی ہیں۔ قرآن کا تقدس واحترام اس زمانہ میں بھی مسلمانوں پر حکمراں تھا اور آج بھی ہے۔ نمازیوں سے جب بھی مسجدیں آباد تھیں اور اب بھی کم وبیش ویران نہیں۔ پھر کیا سبب ہے کہ اس زمانہ کے مسلمانوں کی دینی ودنیوی ترقیات کو۔

آنچہ از مبدء فیاض رسد آن من است

کا دعوٰی تھا اور آج کل کے:

پراگندہ روزی پراگندہ دل

مسلمان تصویر تنزل بنے ہوئے۔

نیافتم کہ فروشند بخت در بازار

کا مرثیہ پڑھ رہے ہیں۔

لیکن اس تعجب کیساتھ تم نے کبھی اس پہلو پر بھی غور کیا کہ بے شبہ اسلام کا مدار صرف قرآن پر ہے اور قرآن دین ودنیا کی ترقی کا سب سے بڑا حامی ہے مگر جب اس کی تعلیمات سے ہم آگاہ ہی نہیں اور قوم کو اس کا نمونہ بنانے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ تو یہ غرض حاصل ہو تو کیونکر ہو۔

(۳)

صحابہ وتابعین کی ملکی اخلاقی وعلمی فتوحات کا یہ سبب نہ تھا کہ وہ ہم سے زیادہ طاقتور تھے اصلی سبب یہ تھا کہ

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیَاتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ۔

(سچے مسلمان تو بس وہی ہیں کہ جب خدا کا نام لیا گیا تو ان کے دل دہل گئے اور جب آیات الٰہی

ان کو پڑھ کر سنائے گئے تو اُن کے ایمان اور بڑھا دیئے وہ اپنے پروردگار ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ (سُورۂ الانفال رکوع ۱۔ آیت ۲)۔

یہی چیز تھی جس نے اُن کی قوت ایمانی وسیع کر رکھی تھی اور مغفرت و رزق کریم (عزت و آبرو کی روزی) نے انھیں یقین دلا دیا تھا کہ خدا کی تمام نعمتیں جب ہمارے ہی لئے ہیں تو ہم ان کے حاصل کرنے کے لئے جد و جہد سے بےفکر کیوں رہیں۔

ہم میں اور اُن بزرگوں میں تمام باتیں بظاہر متشابہ ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ وہ قرآن کریم کے حقیقی مفہوم سے آگاہ تھے اور اس کا عملی نمونہ بنے ہوئے تھے اور ہم نہ اس کی حقیقت ہی سے آگاہ ہیں اور نہ اس پر عمل ہی کرتے۔

شقیق بن سلمہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کی ہے کہ:۔

کان الرجل منا اذا تعلم عشر آیات	ہم لوگ جب قرآن کی دس آیتیں سیکھ لیتے تو جب تک
لم یجاوزھن حتی یعرف معانیھن	اُن کی حقیقت سے آگاہ نہ ہو لیتے اور اُن پر عمل نہ کرتے
والعمل بھن [۱]	آگے نہیں بڑھتے تھے۔ [۱]

ابو عبدالرحمن متعدد صحابہ سے روایت کرتے ہیں کہ

تعلمنا القرآن والعمل جمیعاً [۲]	ہم لوگوں نے قرآن اور اُس پر عمل کرتے رہنے کی تعلیم سب کی سب ایک ہی ساتھ حاصل کی [۲]۔

اس تصریح کو دیکھو اور پھر اپنی حالت کا اندازہ کرو۔

"کوئی نسبت بھی ان آنکھوں سے ہے پیمانے کو" قرآن کریم سے جو بیگانگی ہم کو اب ہے اور جس تنزل میں ہم آج مبتلا ہیں اُس کو دیکھتے ہوئے مشکل یقین آسکتا ہے کہ ہم میں بھی کبھی تمدن رہا ہوگا۔ اور اُس تمدن کی بنیاد قرآن نے ڈالی ہوگی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس قطرے کی ہم ایک ننھی سی جان دیکھ رہے ہیں ایک زمانے میں وہی "طوفان در بغل" تھا اور اسی نے دریا میں روانی پیدا کی تھی"۔

[۱] تفسیر ابن جریر جلد ۱ صفحہ ۲۶ (طبع میمنیہ مصر) [۲] ابن جریر۔ صفحہ ۲۷

۔۔۔۔۔۔۔ ۳ ۔۔۔۔۔۔۔

اسلام نے جس تمدن سے زمانہ کو روشناس کیا تھا اس کی عمارت قرآن ہی کی بنیاد پر تعمیر ہوئی تھی اس لئے یہ قدرتی بات تھی کہ مسلمان اپنے عہد تمدن میں قرآن کے حقائق و معارف پر زور دیں دنیا کو اس کا حلقہ بگوش بنانے کے لئے انتہائی کوشش کے ساتھ اس کی تعلیمات کو پھیلائیں اور اُن کے مفہوم کو عام کریں اس غرض کے لئے دنیا کی مختلف زبانوں میں قرآن کریم کی بےشمار تفسیریں تالیف ہوئیں جن میں صرف ایک عربی زبان کو لو تو کئی تفسیریں نکلیں گی۔ ان میں بعض تفسیروں کو وسعت بیان نظرانداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔

مثلاً: کتاب الاستغناء — شیخ ابو بکر محمد بن علی بن احمد المتوفی ۳۰۹ھ نے ایک سو جلدوں میں یہ تفسیر تالیف کی تھی ۱؎

کتاب التحریر والتحبیر — اس کی پچاس سے زائد جلدیں ہیں ۲؎

تفسیر ابن الجوزی — ستائیس جلدوں میں ہے ۳؎

تفسیر ابن النقیب — کچھ اوپر پچاس جلدوں میں ہے ۴؎۔

تفسیر الادفوی — علامہ ادفوی روم کے نامور عالم تھے۔ یہ تفسیر انھوں نے ۲۰ جلدوں میں لکھی تھی۔ ۵؎

تفسیر الاصبہانی — ابو مسلم اصفہانی جن کی تفسیر کے اقتباسات جابجا تفسیر کبیر میں درج ہیں اور امام رازی اکثر مقامات پر اُن کے ثناخوان رہتے ہیں۔ اس تفسیر کے وہی مؤلف ہیں ۶؎ اس کی تیس (۳۰) جلدیں تھیں۔

۱؎ کشف الظنون جلد ۱ صفحہ ۹۲۔ (طبع قسطنطنیہ)
۲؎ کشف الظنون جلد ۱ صفحہ ۲۵۷۔
۳؎ " " جلد ۱ " ۳۰۴۔
۴؎ کشف صفحہ ۳۰۵۔
۵؎ " صفحہ ۳۰۵۔
۶؎ کشف صفحہ ۳۰۶۔

تفسیر سبط ابن الجوزی	تیس جلدیں ہیں [۱]
تفسیر القزوینی	تین سو جلدوں میں ہے [۲]
کتاب الجامع فی التفسیر	تیس جلدوں میں ہے [۳] ۔
تفسیر حدائق ذات بہجۃ	پانسو جلدوں میں ہے [۴]

اس کمال وسعت کو دیکھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ تفسیر قرآن کریم کی موسوعات یا دائرۃ المعارف (سائیکلوپیڈیا) نہ رہی ہوں گی۔ تاریخ میں کوئی ایسی مثال موجود نہیں کہ کسی کتاب پر اتنی توجہ کی گئی ہو اور اس کے احکام وضوابط کی تحقیقات میں اس قدر شرحیں اور تفسیریں تالیف ہوئی ہوں۔ اور پھر بھی زمانہ کے حقیقت شناس حلقوں سے یہی آواز آ رہی ہو کہ القرآن لاتفنی عجائبہ ولا تنقضی غرائبہ (قرآن کے عجائب و غرائب ختم ہونے ہی کو نہیں آتے)۔

—— ۴ ——

قرآن میں اخلاق بھی ہے اور فلسفۂ اخلاق بھی لیکن انداز بیان اس قدر دل آویز دلنشین ہے کہ ان علوم کو خواہ کوئی جانتا ہو یا نہ جانتا ہو مگر طبع سلیم کا یہی اقتضا رہتا ہے کہ آیات قرآنی کان تک پہونچیں اور دماغ سے ہوتی ہوئی دل میں گھر کر لیں۔ ابتدائی صدیوں کے مفسروں اور ان کی تفسیروں کو دیکھو۔ اُن میں نہ منطقی دلائل ہیں۔ نہ فلسفی اصطلاحات ہیں۔ نہ علوم ہیأت و ریاضت وطبیعت کے زور سے استدلال کو طاقتور بنانے کا شائبہ ہے۔ صاف صاف باتیں ہیں اور عملی پہلو لئے ہوئے ہیں۔

---

[۱] کشف صفحہ ۳۰۹ ؎

[۲] کشف صفحہ ۳۱۴ ؎

[۳] کشف صفحہ ۸۶ ۲ ؎

[۴] کشف صفحہ ۲۱ ۴ ؎

شقیق بن سلمہ اور ابو وائل بیان کرتے ہیں کہ امیرالمومنین علیؓ ابن ابی طالب نے اپنے عہد خلافت میں ایک مرتبہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کو امیر الحج بنا کر بھیجا تھا۔ ابن عباسؓ نے خطبۂ حج کو اس انداز سے بیان کیا اور سورۂ نور کی اس طرح تفسیر فرمائی کہ کفار ترک و روم اگر اسے سنتے تو مسلمان ہو جاتے۔

اسی طرح سورۂ بقرہ کی ایک مرتبہ ایسی معنی خیز و مؤثر تفسیر کی کہ ایک شخص بے اختیار چلا اٹھا کہ لو سمع ھٰذا الدیلم لاسلمت (کفار دیلم اگر اس کو سنتے تو یقیناً مسلمان ہو جاتے)[1]

یہ صرف خیال ہی خیال نہ تھا بلکہ واقع میں نامسلمان قوموں کو جب کبھی تعلیمات قرآنی کے سننے اور سمجھنے کا اتفاق ہوتا پھر ان کے مسلمان ہو جانے میں کوئی تامل نہ رہ جاتا۔ تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ متاخرین نے افسوس ہے کہ یہ خصوصیت بالکل ترک کر دی۔

(۵)

آجکل کی تفسیروں میں تعیین معانی و بیان کے دقائق بھی ملیں گے حکمت و فلسفہ کی نکتہ آفرینیاں بھی آئیں گی۔ ہر ایک بات میں پیچیدگی و مشکل پسندی و عجائب پرستی کا طومار بھرا ہوا ہوگا۔ مگر ان چیزوں میں جتنی زیادتی ہوتی گئی۔ اتنی ہی اس خصوصیت میں کمی آتی گئی جس سے منشار قرآن وابستہ تھا۔

اس سے بھی زیادہ مقام تاسف یہ ہے کہ بڑی بڑی تفسیروں میں ایک ایک آیت کے لئے متعدد مطالب اور مختلف روایتیں مذکور ہیں جن میں صحیح بھی ہیں اور غلط بھی۔ کیونکہ اگلے وقتوں میں بزرگوں کا مقصد یہ ہوا کرتا تھا کہ آیات کے مفہوم میں جتنے اقوال منقول ہوں یا ہو سکتے ہوں ناظرین کے روبرو وہ تمام باتیں پیش کر دی جائیں اور ہر ایک سخن شناس نظر کے لئے یہ موقع حاصل رہے کہ اصول تفسیر کی مدد سے ان اقوال میں سے جو حق ہے اس کو محکم اور جو باطل ہے اس کو زاہق بتا سکے، یہی نکتہ ہمارے پیش نظر ہے۔ راست راست بے کم و کاست ہزار نکتۂ باریکتر ز مو اینجاست۔ اس کی تشریح کے لئے آئندہ اشاعتوں کا انتظار کیجئے اگرچہ یہ موہبت الٰہی آپ اب اپنے وقت پر فیض ہو جانے والی ہے، انتظار کی ضرورت ہی نہیں۔ جو وعدہ ز رسد او خود بیا دخواہد داد بذوق خویش سراہ انتظار مگیر

[1] ابن جریر جلد اصفحہ ۲۷

کلامِ رسول کی اہمیت
اور
اُس کا ثبوت کتاب و سنت سے

از

جناب مولانا عبدالقدیر صدیقی استاذ دینیات کلیہ جامعہ عثمانیہ

احادیث طیبہ کو بیکار ٹھیرانے اور اپنی رائے سے قرآن شریف کے معانی نکالنے والوں نے حدیث ابی سعید خدری رض لَا تَكْتُبُوا عَنِّي شَيْئًا غَيْرَ الْقُرْآنِ کے معنی غلط لئے ہیں کہ کوئی حدیث لکھو ہی نہیں بلکہ اس کے صحیح معنی یہ ہیں کہ قرآن شریف میں احادیث نہ لکھو تا کہ قرآن و حدیث میں امتیاز رہے ان کے یہ معنے احادیث و آیات ذیل کے خلاف ہیں، نیز اجماع عامۃ الصحابۃ والمسلمین کے بھی بالکل خلاف ہیں ورنہ احادیث کی اتنی جلیل القدر کتابیں تیار ہی نہ ہوتیں۔

مَا آتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔

جو کچھ تمکو رسول دے اس کو لے لو اور جس چیز سے منع کرے اس سے باز رہو (سورۃ الحشر ع ۱)

مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى

ہمارا پیغمبر اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتا تو جو کچھ کہتا ہے، وحی ہے جو اس پر کیجاتی ہے۔ النجم ع ۱۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔

تمہارے لئے رسول اللہ میں ایک بہترین نمونہ ہے۔ (الاحزاب ع ۳)۔

عَنْ اَبِيْ رَافِعٍ رض قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا اُلْفِيَنَّ اَحَدَكُمْ

ابی رافع سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہ پاؤں میں تم میں سے کسی ایک کو اپنی کرسی پر تکیہ دیے

منکما على أريكته يأتيه امر من امري مما امرت به او نهيت عنه لا ادري ما وجدنا في كتاب الله اتبعناه۔

بیٹھا ہے اس کے پاس میرے احکام سے کوئی حکم پہنچتا ہے خواہ میں نے حکم کیا ہے یا منع کیا ہے پھر وہ کہتا ہے میں نہیں جانتا ہم تو جو کتاب اللہ میں پائیں گے اسی کی اتباع کریں گے۔ (رواہ احمد وابوداؤد وترمذی وابن ماجہ وبیہقی فی دلائل النبوۃ و مشکوٰۃ)

عن المقدام بن معد يكرب قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الا اني اوتيت القرآن ومثله معه الا يوشك رجل شبعان على اريكته يقول عليكم بهذا القرآن فما وجدتم فيه من حلال فاحلوه وما وجدتم فيه من حرام فحرموه وان ما حرم رسول الله كما حرم الله

مقدام بن معدیکرب سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں مجھے قرآن دیا گیا ہے اس کے ساتھ اور اتنا ہی۔ ایسا نہ ہو کہ ایک شکم سیر کرسی پر بیٹھا ہو اور کہتا ہو تم پر یہ قرآن ہی لازم ہے، اس میں جو حلال پاؤ اسی کو حلال سمجھو اور جو حرام پاؤ اسی کو حرام سمجھو اور بیشک رسول اللہ کا حرام کہا ہوا بھی ایسا ہی ہے جیسے اللہ کا حرام کہا ہوا۔ (رواہ ابوداؤد وروی الدارمی نحوہ وکذا ابن ماجہ الی قولہ کما حرم اللہ)

عن ابن عمرو بن العاص رضي الله عنه قال كنت اكتب كل شيء سمعته من رسول الله صلى الله عليه وسلم فنهتني قريش وقالوا اتكتب كل شيء ورسول الله صلى الله عليه وسلم بشر يتكلم في الرضا والغضب فامسكت عن الكتابة حتى ذكرت ذلك لرسول الله صلى الله عليه وسلم فاوما باصبعه الى فيه وقال اكتب

عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے کہا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتا لکھ لیا کرتا تھا، قریش کے لوگوں نے مجھے منع کیا اور کہا ہر شے تم لکھ لیتے ہو حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں۔ خوشی ناخوشی کے وقت کلام کرتے ہیں تو میں نے لکھنے سے ہاتھ روک لیا یہاں تک کہ میں نے اس بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا پس آپ نے اپنے دہان مبارک کی طرف انگلی سے اشارہ کرکے فرمایا لکھ۔ قسم ہے اس خدا کی

فو الذی نفسی بیدہ ما یخرج منہ الاحقا۔

جس کے ہاتھ میں میری جان ہے نہ اس سے نکلیگا کلام حق (اخرجہ ابو داؤد و تیسیر صـ۹۲)

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال شکی رجل من الانصار الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یارسول اللہ انی لاسمع منك الحدیث فیعجبنی ولا احفظہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استعن بیمینك و اوما بیدہ الی الخط

ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک انصاری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شکایت کی اور کہا یارسول اللہ میں آپ سے حدیث سنتا ہوں اور وہ مجھے پسند آتی ہے مگر مجھے یاد نہیں رہتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے ہاتھ سے مدد لے اور اپنے ہاتھ سے خط کی طرف اشارہ فرمایا۔

(اخرجہ الترمذی تیسیر صـ۹۴)

وعن ابی ھریرہ رضی اللہ عنہ ماکان فی اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر حدیثا منی الا ماکان من ابن عمرو فانہ کان یکتب ولا اکتب

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے کہا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کوئی شخص مجھ سے زیادہ حدیث یاد رکھنے والا نہ تھا بجز عبداللہ بن عمرو بن العاص کے کہ وہ لکھتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا۔ (اخرجہ البخاری و الترمذی و تیسیر صـ۹۴)

حاملان قرآن

شیخ محمد افضل عمادی

از
مولوی محمد عثمان صاحب عمادی بی۔ ایس سی علیگ

وقت آن شد کہ می از ساغر خورشید زنم   لبے از نور تبسم چو سحر تازہ کنیم
شمس حق افضل و علش قمر مطلع صدق   نوبت سلطنت شمس و قمر تازہ کنیم

ذات منبع ایمان صفات مظہر احسان حق اور باطل کے درمیان مجسم فرقان، نمونہ من کان خُلقهُ القرآن۔ یہ مختصر صرف ان کے معارف قرآنی تک محدود ہے جو خود میں نے ان کی زبان سے سنی تھیں، علی مسمع منی و مرأیً منہ۔ بطور نمونہ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

حیات قتلیٰ

کلام اللہ میں ہے:۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۔ مطلب یہ ہے کہ:۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے انھیں مردہ نہ سمجھو وہ تو اپنے پروردگار کے پاس زندہ ہیں اور اُنھیں روزی ملا کرتی ہے۔

سوال یہ تھا کہ کافروں سے جہاد کرتے ہوئے جو لوگ شہید ہوں کیا ان کے ذیل میں وہ پاک ہستیاں شامل نہیں جو نفس کافر سے دن رات مجاہدہ کرتے رہے اور اسی میں جان دی۔

فرمایا:۔

۱۔ اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے ابتلاے یوم اُحد کا تذکرہ فرمایا ہے کہ مومنین پر جو گذری وہ امتحان

کی ایک صورت تھی کہ مومن منافق سے اور صادق کاذب سے متمیز ہو جائے، یہاں فرمایا ہے کہ ان مومنین میں سے جو منہزم نہ ہوئے اور قتل ہوئے وہ جناب الٰہی میں زندہ ہیں اور رزق پا بندہ ہیں۔ لہذا آیت کو صرف انھیں کی حیات بعد الممات سے تعلق ہے اور بس۔

۲۔ شہدار مذکورین فی ہذہ الآیہ کی نسبت روایات میں اختلاف ہے۔ شہداے احد و شہدائے بدر و شہدائے بیر معونہ کے لئے روایتیں وارد ہیں۔ اصول میں یہ ضابطہ مقرر ہے کہ "الاعتبار بعموم اللفظ لا بخصوص السبب" اس سے زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ مثلاً شہدائے احد کو جن حالات میں شہادت نصیب ہوئی دوسرے مجاہدین فی سبیل اللہ کو بھی اگر وہ حالات پیش آئیں تو شہادت کے بعد وہ بھی عند اللہ حیّ و مرزوق ہوں گے۔ غیر مقاتلین خواہ کسی درجہ کے ہوں یہ کرامت اُن کے لئے نہیں۔

۳۔ اس آیت کے بعد ہے:۔

فَرِحِیْنَ بِمَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ وَیَسْتَبْشِرُوْنَ	اللہ نے جو ان کو دیا اُس سے اُن کو فرحت ہوگی وہ خوش
بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِھِمْ مِّنْ خَلْفِھِمْ	ہوں گے کہ جو لوگ ان کے پیچھے تھے اور ان سے ملحق نہ
اَلَّا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔	ہوئے وہ بھی اسی روش پر چلیں نہ ان پر خوف حاوی ہوگا
یَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَفَضْلٍ	اور نہ وہ محزون ہونگے۔ اللہ کی نعمت اور فضل سے وہ خوش
وَّاَنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ۔	ہونگے کہ اللہ مومنوں کا اجر ضایع نہیں جانے دیتا۔
اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰہِ وَالرَّسُوْلِ مِنْ	یہ وہ لوگ ہیں کہ زخم رسیدہ ہو چکے تھے پھر بھی اللہ و رسول
بَعْدِ مَآ اَصَابَھُمُ الْقَرْحُ لِلَّذِیْنَ	کا حکم مانا، ان میں سے جن لوگوں نے حسن عمل اور تقویٰ کی
اَحْسَنُوْا مِنْھُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِیْمٌ	شان دکھائی ان کے لئے بڑا اجر ہے۔
اَلَّذِیْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ	یہ حسن عمل اور تقویٰ کی شان دکھانے والے ایسے تھے کہ جب
جَمَعُوْا لَکُمْ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا وَّقَالُوْا	لوگوں نے انھیں خبر دی کہ تمہارے خلاف دشمن انبوہ در انبوہ

حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْل — تمہیں ان سے ڈرنا چاہئے اس خبر نے بجائے ڈرانے کے ان کا ایمان بڑھا دیا اور وہ بول اٹھے کہ ہمیں اللہ کافی ہے اور وہی بھروسے کے بہترین قابل ہے۔

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ — یہ کہنا تھا کہ ان پر اللہ کی نعمت اور فضل نے پلٹا کھایا، سلامت رہے کوئی قتل، زخم، خوف انھیں چھو تک نہ گیا رضائے الٰہی کی پیروی کی اور اللہ بڑا فضل والا ہے۔

یہ تمام آیتیں انھیں مقتولین مومنین سے متعلق ہیں جو غزوات میں قتل ہو چکے تھے، مجاہد بالنفس کی فضیلت میں کیا کلام ہے؟ مگر ان آیات کو اس سے سروکار نہیں، یہاں مقتولین کی حس حیات و رزق کا تذکرہ ہے وہ انھیں تک محدود ہے اور کلام اللہ نے "الذین" سے خود ان کی تخصیص کر دی ہے۔

غلبۂ نصاریٰ

سلطنت چین پر نصاریٰ کے ہجوم کا تذکرہ تھا، فرمایا:۔ نصاریٰ کو غلبہ دوام ہوگا علت دریافت کی تو یہ آیت پڑھی:۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ۔ — وہ وقت یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے عیسیٰ میں تجھے وفات دینے والا ہوں اور اپنے پاس اٹھانے والا ہوں اور جن لوگوں نے کفر کیا اُن سے تجھے پاک کرنے والا ہوں اور جن لوگوں نے تیری پیروی کی ان کو کافروں پر قیامت تک کے لئے فائق بنانے والا ہوں، اس کے بعد تمہاری بازگشت میرے پاس ہے۔ پھر میں تمہارے درمیان ان سب میں فیصلہ کر دوں گا جن میں تم اختلاف کیا کرتے تھے۔

فرمایا یہ حکم عموم لفظ کی بنا پر ہے، مفسرین یہاں ناحق غلبۂ اسلام سے بحث کرتے ہیں بے شبہ اللہ تعالیٰ نے امت اسلامیہ کو غلبہ و نصرت کی بشارت دی ہے۔

فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ۔ — ہم نے مومنین کی ان کے دشمنوں کے خلاف تائید کی تو ان کا ظہور و غلبہ نمایاں ہو گیا۔

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ ۔ — عزت اور غلبہ اللہ کے لئے ہے رسول اللہ کے لئے اور مومنین کیلئے ہے۔

وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۔ — اللہ تعالیٰ کفار کو مومنین پر ہرگز راہ نہ دے گا۔

قاضی شوکانی کی تالیف "وبل الغمامہ" اسی آیۃ کی تفسیر میں ہے، لیکن :-

سوئے این بادیہ ہرگز نہ وزیدا ست نسیم — سینہ بر برق کشائیم و جگر تازہ کنیم

آیت میں صرف اتباع عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ ہے کہ وہ کفار پر غالب رہیں گے، یہ نہیں کہ مسلمانوں پر بھی اُن کو ہمیشہ غلبہ رہے گا۔

پھر اس میں ایک اور نکتہ ہے، اور یہ ایسا نکتہ ہے کہ تمام تفاسیر کا برہم زن ہوگا۔

ما برق جائے شمع بکاشانہ آوریم — آتش بہ پاسبانی پروانہ آوریم

"اَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ" جس طرح نصاریٰ مراد ہیں اسی طرح "اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا" کے مصداق یہودی ہیں کیونکہ یہاں کفر کے معنی صرف انکار کے ہیں اور منکرین عیسیٰ علیہ السلام کوئی اور نہ تھے، دعوت عیسوی کو فرصت ہی نہ ملی کہ یہود سے تجاوز کرتی۔ لہذا آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اے عیسیٰ جن لوگوں نے تیری پیروی کی اُن کو میں ان لوگوں پر تاقیامت فوقیت دونگا جو تجھ سے منکر ہوئے۔

ظاہر ہے کہ پیروی کرنے والے نصاریٰ تھے اور منکر یہود، رد و قبول عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت انھیں دونوں جماعتوں میں اختلاف تھا جس کے لئے ارشاد ہوا کہ "اے نصاریٰ و یہود، آخر کار تمہیں خدا ہی کے پاس جانا ہے، تمہارے درمیان جو اختلاف ہیں وہیں اُن کا فیصلہ بھی ہو جائے گا۔"

رباطِ خیل

امداد اللہ سے جہاد کے لئے تاکید محل بحث تھی اور آیہ "اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا" کی شہادت پیش ہو رہی تھی۔

فرمایا: بے شبہ اقامت ثغور اسلام کے لئے رباط خیل لازم ہے، لیکن اس آیت میں رباط خیل مراد نہیں بلکہ انتظار صلوٰۃ بعد صلاۃ مقصود ہے۔ ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن کی روایت میں تصریح کر دی گئی ہے کہ "لَمْ یَکُنْ فِی زَمَنِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ غَزْوٌ یُرَابِطُ فِیْہِ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کوئی غزوہ ہی ایسا نہ تھا کہ اس میں رباط خیل کی نوبت آتی یا ضرورت پڑتی"۔

آیت مبحوث عنہا یوں ہے:۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ اے ایمان والو صبر کرو، اپنے مخالفین کے مقابلہ میں استقلال طبع و ثبات قدم کا لحاظ رکھو کہ ایسا نہ ہو ان صفات سے وہ تم پر غالب آئیں اور تم ان سے ہٹے رہ جاؤ اور رباط کرو یعنی ایک نماز ہو چکے تو دوسری نماز کے منتظر رہو اور اللہ کے ساتھ تقویٰ کو ملحوظ رکھو شاید تمہیں فلاح ہو۔

دیکھو امید فلاح کو چار چیزوں سے وابستہ کیا ہے:۔

(۱) صبر۔

۲۔ مصابرۃ

۳۔ انتظار صلاۃ بعد صلاۃ۔

۴۔ تقویٰ۔

ابو ہریرہ سے روایت ہے:۔

اما انہ لم یکن فی زمن النبی ہوشیار رہو جاؤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں

غزو یرابطون فیہ ولکنھا نزلت فی قوم یعمرون المساجد یصلون الصلوات فی مواقیتھا ثم یذکرون اللہ فیھا

کوئی ایسا غزوہ نہ تھا جس میں رباط خیل کی نوبت آتی یہ آیت ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی جو مسجدیں آباد رکھتے تھے ٹھیک وقت پر نمازیں پڑھتے تھے اور جب نماز سے فارغ ہوتے تو پھر اللہ کی یاد میں مصروف ہو جاتے۔

دوسری روایت میں خود آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام ارشاد فرماتے ہیں:۔

الا اخبرکم بما یمحو اللہ بہ الخطایا ویرفع بہ الدرجات۔

کیا میں اُس چیز کی خبر تمھیں نہ دوں جس سے اللہ گناہوں کو مٹاتا اور درجے بڑھاتا ہے؟

وہ چیزیں یہ ہیں:۔

اسباغ الوضوء علی المکارہ	(۱) مکروہات پیش آنے پر پوری طرح وضو کرنا۔
وکثرۃ الخطا الی المساجد	(۲) مسجدوں کی جانب بکثرت قدم اٹھانا۔
وانتظار الصلاۃ بعد الصلاۃ	(۳) ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا منتظر رہنا۔
فذلکم الرباط فذلکم الرباط	یہی رباط ہے یہی رباط ہے۔

اس تفسیر کے بعد سربسجود ہوگئے اور قلب خاشع سے آواز آئی۔

ومالی لا اعبد الذی فطرنی والیہ ترجعون۔

مجھے کیا ہوگیا؟ میں کیوں نہ اس کی عبادت کروں جس نے مجھے پیدا کیا اور تم سب اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہو؟

ءَاَتَّخِذُ مِن دُونِهٖۤ اٰلِهَةً اِن يُّرِدۡنِ الرَّحۡمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغۡنِ عَنِّىۡ شَفَاعَتُهُمۡ وَلَا هُمۡ يُنقِذُونَ۔

کیا اُس کے علاوہ دوسروں کو معبود بناؤں جن کی بے بسی و بے کسی کا یہ عالم ہے کہ اگر اللہ مجھے ضرر پہنچانا چاہے تو نہ ان کی سفارش میرے کام آئے اور خود ان کو نصرت نصیب نہ ہو۔

ایمان بالنبوۃ

من قالَ لا اِلٰہ الا اللّٰہ دخل الجنۃ۔ جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا بہشت میں در آیا' اس کے ساتھ محمد رسول اللہ کہنے کی کوئی شرط نہیں' بہشت مومنین صالحین ہی کے لئے ہے۔ جب لا الٰہ الا اللہ کہنا موجب دخول بہشت ہوا تو یہ بھی ثابت ہو گیا کہ ایمان وصلاح یہی ہے کہ انسان لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت حق وبلاغ صدق پر نظر کرو۔ آپ نے توحید کی تو ہمیشہ تبلیغ کی مگر اپنی نبوۃ کو منوانے پر کبھی زور نہ دیا۔

اس ذیل میں سلسلہ کلام یہاں تک دراز ہوا کہ :۔

(۱) دخول جنت کے لئے ایمان باللہ کافی ہے' ایمان بالنبوۃ کی ضرورت نہیں۔

(۲) نجات آخرت وفلاح عقبیٰ مسلمانوں ہی کے لئے مخصوص نہیں' ان تمام اقوام کے لئے نجات ہے جو مومن باللہ ہوں۔ مومن بمحمد رسول اللہ ہوں یا نہوں' صلی اللہ علیہ محمد وبارک وسلم۔

گفتگو جب اس نوبت تک پہنچ گئی تو فرمایا :۔

ایمان باللہ کے ساتھ ایمان برسول اللہ بھی لازم ہے۔ درجات ایمانی کا ذریعہ تکمیل یہی ہے' یہ نہ ہو تو ایمان ناقص ہو جاتا ہے۔ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ	اے وہ لوگو جو ایمان لائے اللہ پر ایمان لاؤ رسول اللہ پر
وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ	ایمان لاؤ اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر
الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ	نازل کی اور اس کتاب پر بھی جو پہلے نازل ہوئی جس نے
وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ	اللہ کا اللہ کے فرشتوں کا اللہ کی کتابوں کا' اللہ کے پیغمبروں
فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا	کا اور آخرت کے دن کا انکار کیا تو حقیقت میں وہ اتنا

گمراہ ہوا کہ اس کی گمراہی دور تک پہنچ گئی۔

ان آیات سے واضح ہے کہ :۔

۱- اللہ کے مخاطب وہی لوگ تھے جو اللہ پر ایمان لاچکے تھے، مگر یہ ایمان کامل نہ تھا اس لئے حکم کیا پھر سے اللہ پر ایمان لائیں، رسول اللہ پر ایمان لائیں کتاب اللہ پر ایمان لائیں۔

۲- مومن کے لئے ضروری ہے کہ اللہ کا اقرار کرے، اللہ کے فرشتوں کا اقرار کرے اللہ کی کتابوں کا اقرار کرے، یوم آخر کا اقرار کرے، ان میں سے کسی ایک کا بھی جس نے انکار کیا وہ گمراہ ہوا۔

۳- ضلال بعید کے معنی یہ ہیں کہ "هو الضلال عن الحق بحيث يعسر العود منه إلى سواء الطريق فهؤلاء لا يرجى لهم ان يعودوا إلى الصراط المستقيم" یعنی حق سے اس طرح گمراہ ہونا کہ پھر راہ راست پر آنا دشوار ہو، یہی ضلال بعید ہے، ایسے گمراہوں کے لئے امید نہیں کہ صراط مستقیم پر لوٹ سکیں۔

اللہ نے ایمان کے جو مدارج قائم کئے ان میں ایمان بر رسول اللہ بھی ہے، جو رسول اللہ پر ایمان نہ لائے وہ ایسا بے ایمان ہے کہ پھر اس کے لئے ہدایت کی امید ہی نہیں یہی ضلال بعید ہے اور اسی کی وعید ہے۔

رسائل و مسائل

کیا رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے؟

ایک صاحب نے ماہ شوال ۵۲ھ کے ترجمان القرآن میں "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی" کے زیر عنوان ایمان کی بحث پڑھ کر ایک شبہ پیش کیا ہے جو درج ذیل ہے:-

اسلام کا مقصود بالذات توحید و عبادت الٰہی ہے۔ انبیا محض ذریعہ ہیں اور ان پر ایمان مقصود اصلی نہیں ہے۔ ہر شخص ایمان کے لئے اپنی وسعت علم اور فکر تک مکلف ہے، لہٰذا اگر کوئی غیر مسلم توحید پر ایمان رکھے اور اپنے طریق پر عبادت الٰہی کرے مگر اپنے علم اور فکر سے کام لینے کے باوجود رسالت کے متعلق نیک نیتی سے شکوک رکھتا ہو، ایسے شخص کو ناجی قرار نہ دینے کی معقول وجہ کیا ہے؟ اس سلسلہ میں ذیل کی آیات توجہ کے قابل ہیں:-

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ الخ (۳:۶۴)۔

وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ ..... لَيْسُوا سَوَاءً مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ - وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوهُ

وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالْمُتَّقِیْنَ۔ (۳: ۱۲)۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ یُؤْتِكُمْ كِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ (۵۷: ۴)۔

آیت موخرالذکر کے متعلق یہ بھی بتائیے کہ "کفلین" سے کیا مراد ہے اور کفل تثنیہ کیوں ہے؟

اس مسئلہ پر ترجمان القرآن کی گذشتہ اشاعتوں میں کافی بحث کی جاچکی ہے۔ اگر اس کو بنظر غائر ملاحظہ کیا جاتا تو غالباً یہ شبہ آپ سے آپ رفع ہوجاتا تاہم یہاں پھر ایک مرتبہ اس مسئلہ کو واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے امید ہے کہ اس کے بعد کوئی شبہ باقی نہ رہے گا۔

آپ نے اپنے پہلے فقرے میں اسلام کا جو مقصد بیان فرمایا ہے وہ دراصل اسلام کے مقصد کا پورا بیان نہیں بلکہ اس کا صرف ایک حصہ ہے لیکن میں بخوف طوالت اس بحث میں نہ پڑونگا۔ میں یہاں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اسلام کا جو ادھورا مقصد آپ نے متعین کیا ہے، اس کو حاصل کرنے کے لئے بھی انبیاء علیہم السلام کی رہنمائی ناگزیر ہے

سب سے پہلا سوال جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے، یہ ہے کہ اسلام کا جو مقصد آپ قرار دیتے ہیں اس کے حصول کا یقینی ذریعہ کیا ہے؟ "توحید" جس چیز کا نام ہے وہ صرف "خدا کو ایک کہنا" ہی نہیں ہے بلکہ وہ دراصل اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا صحیح علم ہے اسی طرح "عبادت الٰہی" کا مفہوم بھی صرف اسی قدر نہیں ہے کہ کسی نہ کسی طور پر خدا کی پرستش کی جائے، بلکہ صحیح معنوں میں اللہ کی عبادت یہ ہے کہ انسان شرک کے تمام شائبوں سے بچ کر اپنی بندگی کو اس ذات پاک کے لئے خالص کردے۔ یہ دونوں چیزیں (یعنی علم و معرفت کی صحت، اور عبادت کا خلوص) اسلام کی اصطلاح میں "ہدایت" کے جامع نام سے موسوم ہیں۔ اور قرآن کہتا ہے کہ ہدایت جس شئے کا نام ہے وہ وہی ہے جو خدا کی طرف سے عطا ہو۔ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ (۳: ۸) اور خدا کی طرف سے ہدایت پانے کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ یا تو کسی کے پاس براہ راست خدا کی طرف سے ہدایت آئے۔ یا کسی ہدایت یافتہ آدمی کا اتباع کیا جائے۔ پہلا شخص اسلام کی اصطلاح میں رسول یا نبی ہے۔ اور دوسرے شخص کے لئے اصطلاحی نام "مومن" اور "مسلم" ہے

پس اگر کوئی شخص توحید کا صحیح علم رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے لئے اس کی عبادت خالص ہو چکی ہے، تو لامحالہ یا تو وہ خود نبی ہے یا کسی نبی کا متبع لیکن اگر وہ ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے تو اس کے پاس علم نہیں ہے محض "ظن" اور "خرص" ہے وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (۵۳:۲۸) اور جب اس کے پاس علم نہیں ہے تو اس کی عبادت بھی خالص نہیں ہو سکتی، کیونکہ عبادت کا خلوص دراصل علم و معرفت کی صحت ہی پر مترتب ہوتا ہے۔

آپ کو یہ مطالبہ کرنے کا حق ہے کہ قرآن کے اس دعویٰ پر عقلی دلیل پیش کی جائے۔ میں اس مطالبہ کو پورا کرنے کے لئے حاضر ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ انسان کی فطرت میں خدا کی معرفت اور اس کے لئے بندگی کے خلوص کی استعداد موجود ہے جیسا کہ قرآن میں کہا گیا ہے کہ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (۳۰:۳۰)۔ اور حدیث نبوی میں آیا ہے کہ كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى فِطْرَةِ الْاِسْلَام لیکن اس فطری استعداد کے قوت سے فعل میں آنے کے لئے چند شرائط ہیں، اور بادنیٰ تامل یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ شرائط ہر شخص میں پوری نہیں ہوتیں۔

پہلی شرط قوت مشاہدہ کی تیزی ہے تاکہ انسان آنکھیں کھول کر آفاق اور انفس میں اللہ کی نشانیوں کو دیکھے اور صفات الٰہی کے ان نشانات کو پہچانے جو کائنات کے ہر ذرے اور خود انسان کے اپنے وجود میں پائے جاتے ہیں لیکن نوع انسانی کی ایک بڑی اکثریت اس قوت مشاہدہ سے محروم ہے وہ آثار و مظاہر کے صرف ظاہری پہلو کو دیکھتے ہیں مگر ان کے باطن کی طرف توجہ بھی نہیں کرتے۔ چنانچہ قرآن اس کی شکایت کرتا ہے کہ وَكَأَيِّنْ مِنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ (۱۲:۱۰۵) "آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ایسی ہیں جن پر سے وہ گذر جاتے ہیں اور التفات ہی نہیں کرتے"۔ وَإِنَّ كَثِيرًا مِنَ النَّاسِ عَنْ آيٰتِنَا لَغٰفِلُونَ (۱۰:۹۲) "لوگوں میں سے بہت سے ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں

سے غافل ہیں"۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ سرے سے مشاہدہ کی قوت ہی نہیں رکھتے ان کے لئے معرفت کا دروازہ کبھی نہیں کھل سکتا۔

دوسری شرط یہ ہے کہ انسان میں غور و فکر کا مادہ موجود ہو، اور وہ بھی صحیح و سلیم ہو، تاکہ انسان اپنے مشاہدات کو صحیح طریقے سے ترتیب دے کر ان سے صحیح نتائج اخذ کرسکے یہ شرط پہلی شرط سے بھی زیادہ کمیاب ہے۔ اول تو غور و فکر کرنے والے افراد ہی نوع انسانی میں بہت کم ہیں، اور جو ہیں اُن میں بھی صحیح الفکر افراد کم پائے جاتے ہیں جیسا کہ قرآن مجید بار بار کہتا ہے کہ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ اور وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ یہ غور و فکر کا فقدان، اور صحت فکر کی کم یابی اُن موانع میں سے ہے جو انسان کو علم حق تک پہنچنے سے روکتے اور اسے ٹیڑھے راستوں پر ڈال دیتے ہیں۔ اگرچہ راہ راست کے نشانات ہر طرف موجود ہیں، مگر جو شخص ان نشانات کو سمجھتا ہی نہ ہو وہ کیونکر صحیح راستہ کو پاسکتا ہے یہی بات قرآن مجید میں کہی گئی ہے کہ ہم اپنی نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں مگر ان کے لئے جو عقل رکھتے ہوں وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۳۰:۴)۔ اور دیکھئے کہ یہی بات دوسرے موقع پر کتنے زور کے ساتھ کہی گئی ہے۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ۔ (۷:۲۲)	ہم نے جنوں اور انسانوں میں سے ایک بڑی تعداد کو دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے جن کا حال یہ ہے کہ دل رکھتے ہیں مگر ان سے کچھ بوجھ کا کام نہیں لیتے، آنکھیں رکھتے ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں کان رکھتے ہیں مگر ان سے سنتے نہیں، وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گم راہ، یہ وہی لوگ ہیں جو غفلت برتنے والے ہیں۔

تیسری شرط یہ ہے کہ انسان کی فطرت اتنی سلیم ہو کہ وہ سوسائٹی کے اثرات، باپ دادا کی تربیت

اور خاندانی و قومی روایات سے متاثر نہ ہو اور ان تمام پردوں کو چاک کرکے نور حقیقت کو صاف صاف دیکھ سکے۔ یہ شرط پہلی دونوں شرطوں سے بھی زیادہ کم یاب ہے۔ بڑے بڑے ذی علم، عاقل اور ذکی و فطین لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ سوسائٹی اور خاندان کے اثرات سے آزاد نہیں ہو سکتے جس ڈگر پر ماحول نے ان کو ڈال دیا ہے اسی پر چلے جا رہے ہیں، اور اسی کو حق سمجھتے ہیں۔ قرآن مجید اس کو بھی گمراہی کا اہم سبب بتاتا ہے۔ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ (۵:۱۰۴)۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ انسان میں حق پسندی اور اس کے ساتھ قوت ارادی اتنی زبردست ہو کہ وہ خود اپنے نفس کی خواہشات اور رجحانات کا مقابلہ کر سکے، کیونکہ ہوائے نفس اول تو معرفت حق ہی میں مانع ہوتی ہے، اور اگر کوئی شخص حق کو پہچان بھی لے تو وہ اس کو قلب و روح میں جاگزیں کرنے اور بندگی و عبادت کو خدا کے لیے خاص کر دینے میں قدم قدم پر مزاحمت کرتی ہے۔ چونکہ انسان کے نفس میں یہ ایسی زبردست قوت ہے جو اکثر اس کی عقل و فکر پر چھا جاتی ہے، اور بسا اوقات اس کو جانتے بوجھتے غلط راستوں پر بھٹکا دیتی ہے اس لئے معمولی آدمی تو درکنار بڑے بڑے لوگ بھی جو اپنے علم و فضل اور اپنی عقل و بصیرت اور فہم و فراست کے لحاظ سے یکتائے روزگار ہوتے ہیں، اس رہزن کی شرارتوں سے بچنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس چیز کو قرآن مجید میں بھی گمراہی کا سب سے بڑا سبب قرار دیا گیا ہے وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِنَ اللَّهِ (۲۸:۵۰) "اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا جس نے اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی ہوائے نفس کی پیروی کی"۔ أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً (۴۵:۲۳) "تو کیا تو نے دیکھا اس شخص کو جس نے اپنی خواہشات نفس ہی کو اپنا خدا بنا لیا باوجودیکہ وہ علم رکھتا تھا مگر (جب اس نے ایسا کیا تو) اللہ نے اسے بھٹکا دیا اور اس کے کانوں اور اس کے دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا"۔ اور تو اور بسا اوقات پیغمبروں تک کو اس نفس شریر کی

رہزنی کے خطرے پیش آئے ہیں۔ چنانچہ حضرت داؤد جیسے جلیل القدر پیغمبر کو ایک موقع پر تنبیہ کی گئی ہے کہ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۳۸ : ۲) "ہوائے نفس کی پیروی نہ کرو تجھے اللہ کے راستہ سے بھٹکا دے گی۔"

آخری شرط یہ ہے کہ انسان کی وجدانی قوتیں بیدار ہوں اس کے ذہن کا سانچہ ایسا ہو کہ صحیح اور حق بات سوچنے اور سمجھنے کے لئے غور و فکر اور استدلال عقلی کا زیادہ محتاج نہ ہو، بلکہ فطرۃً وہ غلط بات کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہو اور قیاس و استدلال کے بغیر محض حدس (Intuition) کی قوت سچی اور حق بات تک پہنچ جائے۔ یہ شرط سب سے زیادہ کڑی مگر معرفت کی تکمیل کے لئے سب سے زیادہ اہم ہے انسان کا مشاہدہ خواہ کتنا ہی صحیح ہو، غور و فکر اور تعقل و تدبر کی قوت سے وہ کتنا ہی بہرہ مند ہو، اور تقلید غیر و بندگی نفس کی زنجیروں سے کیسا ہی آزاد ہو لیکن جو حقیقتیں اس کے حواس سے ماورا ہیں، اور جن کی پوری کنہ پر اس کی عقل اپنی طبیعت کے لحاظ سے حاوی ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی، ان کا علم اور علم یقین اس کو محض آثار کے مشاہدے اور محض آزاد تفکر کی بدولت حاصل نہیں ہو سکتا۔ وہ ان حقیقتوں کے قریب تک پہنچ سکتا ہے، مگر ان کا ادراک نہیں کر سکتا۔ وہ عقل کے زور پر زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ شاید ایسا ہو، اغلب ہے کہ ایسا ہی ہو، یا حد سے حد یہ کہ ایسا ہونا چاہئے، لیکن محض تعقل اس کو اتنی قوت بہم نہیں پہنچا سکتا کہ وہ جزم و یقین کے ساتھ کہہ سکے کہ فی الواقع ایسا ہے اور یہی حقیقت اور صداقت ہے، اور اس کے سوا جو کچھ ہے قطعاً باطل اور غلط ہے یہ جزم اور یقین اور ایمان کامل کی کیفیت صرف "حدس" سے پیدا ہوتی ہے۔ عرفان کی آخری منزل میں پہنچ کر قیاس و استدلال کام نہیں دیتا۔ وہاں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ذہن میں ایک روشنی نمودار ہوتی ہے اور وہ ان کی آن میں حقیقت کا مشاہدہ کرا دیتی ہے؛ ایسا ہی مشاہدہ جیسا کہ ہم اپنی آنکھوں سے کسی مرئی چیز کا کرتے ہیں۔ اسی مشاہدہ پر جزم و یقین کی بنا قائم ہوتی ہے۔ اس وقت انسان کا اعتقاد گمان اور اندازے اور اٹکل جیسی کمزور اور متزلزل بنیادوں پر نہیں ہوتا، بلکہ وہ دل کی آنکھوں سے ایک شاہد کے

ایسی دیکھی بھالی بات پر ایمان لاتا ہے جس کی صداقت میں شک اور شبہ اور جانب مخالف کے امکان کا کوئی شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اِسی کا نام معرفت کامل ہے اور جب تک معرفت کا یہ درجہ حاصل نہ ہو، انسان نہ تو پورا پورا خدا شناس ہو سکتا ہے اور نہ خدا کے لئے اس کی بندگی خالص ہو سکتی ہے لیکن حدس کی یہ روشنی جس پر معرفت کی تکمیل موقوف ہے، انسان کے اپنے بس کی نہیں۔ نہ وہ اس کی حقیقت سے واقف ہے، نہ اُس کو پیدا کرنے پر قادر ہے، اور نہ کسب و کوشش سے اس کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ محض خداداد ہے، اور یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن مجید میں "نُورِ خداداد"، اور "برہانِ رب"، اور "ھدایت الٰہی" اور "تعلیم خداوندی" سے تعبیر کیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ (۲۴: ۵) "جس کو اللہ نے روشنی نہ دی ہو اس کے لیے پھر کوئی روشنی نہیں"۔ اور حضرت یوسفؑ کے متعلق فرمایا جاتا ہے کہ لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ (۱۲: ۳) "اگر وہ اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا تو وہ بھی بھٹک جاتا" اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ قُلْ اِنَّنِیْ ھَدٰىنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۶: ۲۰) "لوگوں سے کہدو کہ مجھ کو میرے ربّ نے راہ راست کی طرف ہدایت بخشی ہے" اور حضرت موسیٰ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا (۲۸: ۲) "اور جب وہ پوری جوانی کو پہنچا اور پورا آدمی بن گیا تو ہم نے اس کو قوت فیصلہ اور علم عطا کیا"۔

اب ان پانچوں شرطوں پر غور کیجئے۔ اگر آپ کو ان میں سے کسی شرط کی ضرورت سے انکار ہے تو وجہ انکار ارشاد ہو۔ اگر کسی شرط کے بغیر انسان صداقت اور حقیقت تک پہنچ سکتا ہو تو دلیل پیش فرمائی جائے۔ اور اگر حقیقت رسی کے لئے ان پانچوں شرطوں کا حاصل ہونا آپ کی رائے میں بھی لازم ہے، تو بتایئے کہ کتنے لاکھ نہیں کتنے کرور، بلکہ کتنے ارب انسانوں میں سے ایک میں یہ شرطیں اس کمال کے ساتھ پوری ہوتی ہیں کہ وہ خداوند جل و علیٰ جیسی سرحد ادراک سے وراء الورا ہستی کی معرفت کامل حاصل کر سکے؟ اگر آپ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ جنس گراں کمیاب ہے، تو پھر فرمایئے کہ ان کروروں بندگانِ خدا کا کیا حشر ہو جو اس سے محروم ہیں، یا اگر بہرہ مند بھی ہیں تو اس درجہ میں نہیں؟ کیا ہر شخص کو اس کے ناقص ذرائع کے ساتھ چھوڑ دیا جائے کہ وہ خود اپنی اندھی آنکھوں

اور مفلوج پاؤں کے ساتھ خود ہی راستہ ٹٹول کر چلے، جس چیز کو چاہے "نیک نیتی" کے ساتھ خدا سمجھے، اور جس طرح چاہے اس کی پوجا کرے؟ اگر آپ کا یہی خیال ہے تو آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہر شخص کو اپنے مرض کا علاج آپ کرنا چاہیے۔ کسی طبیب اور ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص کو اپنا راستہ آپ تلاش کرنا چاہیے۔ کسی سے راستہ پوچھنے اور کسی کو راستہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص کو علم خود ہی حاصل کرنا چاہیے۔ کسی استاد اور معلم کی حاجت نہیں۔ کیا اس دنیا کا نظام یونہی چل رہا ہے؟

انسان کے محدود ذہن میں اتنی سمائی نہیں ہے کہ تمام جہان کی قابلیتیں بیک وقت اس میں جمع ہو جائیں حتیٰ کہ وہ اپنے ہر کام میں دوسروں کی مدد سے بے نیاز رہے۔ دوسری طرف انسان کی ضروریات اتنی وسیع اور گوناگوں ہیں، کہ ان میں سے ہر ایک کے لئے ایک خاص قسم کی قابلیت درکار ہے، اور زندگی کا ہر شعبہ اپنے لئے مناسب حال قابلیتیں چاہتا ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے مختلف انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے مختلف لوگوں کو مختلف قابلیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ کسی کو طب سے لگاؤ ہے اور وہ لوگوں کی طبی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ کسی کو قانون سے لگاؤ ہے۔ کسی کو تجارت سے، کسی کو کاشتکاری سے، کسی کو صنعت وحرفت سے، کسی کو حکومت وسیاست سے۔ یہ سب اپنے اپنے شعبے میں نوع انسانی کے محتاج الیہ ہیں، اور ہر شعبۂ زندگی کے مخصوص معاملات میں دوسرے تمام شعبوں کے لوگ اسی خاص شعبے کے آدمیوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جو شخص اس نظام کو توڑ کر آپ ہی اپنا طبیب، اپنا وکیل، اپنا مزارع، اپنا بیوپاری اور اپنا صناع بننے کی کوشش کرے گا۔ وہ خواہ کتنی ہی "نیک نیتی" سے اس حماقت کا مرتکب ہو، فطرت کے نظام کو توڑنے کا نتیجہ بہرحال ظاہر ہوگا اور وہ یقیناً ناکام زندگی بسر کرے گا۔

یہ نظام جس طرح زندگی کے تمام معاملات میں درست ہے اسی طرح، مذہب کے معاملہ میں بھی درست ہے یہاں بھی ہر شخص اس خاص قابلیت سے بہرہ مند نہیں ہے جو معبود کو پہچاننے اور اس کی صحیح طریقے سے عبادت کرنے کے لئے ضروری ہے۔ یہ قابلیت بھی خاص خاص لوگوں کو عطا کی گئی ہے۔ انہوں نے معبود کو پہچانا ہے اور اس کی

نشانیاں کھول کھول کر بیان کر دی ہیں، اس کی عبادت و بندگی کا صحیح طریقہ دریافت کیا ہے، اور اس کو بھی بتا گئے ہیں، عقلمند انسان کا کام یہ ہے کہ اس شعبے میں اسی شعبے کے ماہروں پر اعتماد کرے جیسی تعلیم انہوں نے دی ہے اس کو قلب و روح میں جگہ دے، اور جو طریق عبادت و بندگی انہوں نے اپنے قول اور عمل سے پیش کیا ہے۔ اسی کا اتباع کرے۔ وہ بلاشبہ اس معاملہ میں بھی اپنی عقل کو استعمال کر سکتا ہے لیکن یہاں عقل کے استعمال کی صحیح صورت یہ نہیں ہے کہ وہ خود اپنی ناقص قوتوں اور اپنے محدود ذرائع پر اعتماد کرکے راستہ ڈھونڈنے کی کوشش کرے اور جو راستہ اپنے نزدیک صحیح معلوم ہو اس پر چلنے لگے، بلکہ اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ وہ اپنے لیے صحیح رہنما تلاش کرے اور جو لوگ مذہب کے میدان میں رہنمائی کے مدعی ہیں ان سب کی سیرت اور ان کی تعلیم پر اپنی حد تک ایک تحقیقی نظر ڈال کر معلوم کرے کہ ان میں سے کون زیادہ بہتر اور صحیح راہ دکھانے والا ہے کس کی ذات میں وہ پانچوں شرطیں بدرجۂ اتم پوری ہو گئی ہیں جو ہدایت یافتہ ہونے کے لیے ضروری ہیں؟ اور کس کی تعلیم سب سے زیادہ معقول اور کس کا طریقہ سب سے زیادہ قابل عمل ہے؟ اس امتحان پر جو شخص پورا اترے اس کی تعلیم کو مان لینا چاہیے اور اس کے اتباع کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس معقول طریقہ کو چھوڑ کر جو شخص غیر معقول طریقہ اختیار کرے گا، وہ خواہ کتنا ہی نیک نیت ہو وہ اپنی غلطی کے برے نتائج ضرور دیکھے گا۔ غلطی خواہ نیک نیتی سے کی جائے یا بدنیتی سے، اس کی ذمہ داری اور اس کے وبال سے انسان بچ نہیں سکتا، جو شخص بیمار ہو اور فن طب کے ماہر کو تلاش کرنے اور اس پر اعتماد کرنے کے بجائے اپنے ناقص علم پر اعتماد کرکے خود اپنا علاج کرنے لگے وہ اپنی اس غلطی کا نتیجہ ضرور بھگتے گا، خواہ یہ غلطی اس نے کتنی ہی نیک نیتی سے کی ہو۔ جو شخص قانون کے معاملہ میں ماہر قانون کو چھوڑ کر خود اپنی ناقص رائے پر عمل کرے گا وہ اپنی حماقت کے نتائج سے نہ بچ سکے گا، چاہے اس نے یہ حرکت انتہائی نیک نیتی کے ساتھ کی ہو۔ غلطی بہرحال غلطی ہے، اور ہر غلطی کے جو فطری نتائج مقرر ہیں وہ ہر حال میں ظاہر ہو کر رہتے ہیں۔ البتہ بدنیتی سے ایک جرم کا اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

اب میں ان آیات کی طرف توجہ کرتا ہوں جو آپ نے اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں پیش فرمائی ہیں اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس قاعدہ کلیہ کو سمجھ لیجیے کہ کسی مسئلہ میں قرآن مجید سے استشہاد کرنے کے لئے ایک دو آیتوں کو چھانٹ کر نکال لینا کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے پورے قرآن پر نظر ڈالنی ضرور ہے تاکہ مسئلہ کے تمام اطراف سامنے آجائیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن مجید کوئی مسلسل تصنیف نہیں ہے جس میں ترتیب کے ساتھ ہر ہر مسئلے کو ایک ایک جگہ مفصل بیان کیا گیا ہو، بلکہ مجموعہ ہے ان آیات کا جو ۲۳ سال کی طویل مدت میں موقع اور ضرورت کے لحاظ سے نجماً نجماً نازل ہوتی رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے جتنے مہمات مسائل ہیں وہ سب کسی ایک جگہ اپنی پوری پوری تفصیلات کے ساتھ بیان نہیں کر دئے گئے ہیں، بلکہ پورے قرآن میں پھیلے ہوئے ہیں اور مختلف آیات میں موقع و محل کے لحاظ سے ان کے اطراف بیان کئے گئے ہیں۔ پس اگر آپ رسالت کے مسئلہ میں قرآن کی تعلیم ٹھیک ٹھیک معلوم کرنا چاہتے ہیں تو پورے قرآن پر مجموعی نظر ڈالیے۔ ایک دو آیتوں کو چھانٹ کر سلسلہ سے الگ کر لینگے تو غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں گے۔

اس قاعدہ کے مطابق جب آپ قرآن کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآن کا مدعا ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہر شخص آپ اپنا راستہ تلاش کرنے کے لئے آزاد ہے اور ہر راستہ جس کو وہ نیک نیتی کے ساتھ درست سمجھتا ہے وہی حقیقت میں بھی صحیح ہے۔ قرآن تو کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس وقت بنی آدم کو زمین پر اتارا تھا اسی وقت اس نے ان کو سیدھا راستہ بتلانے کا کام خود اپنے ذمے لیا تھا اور ان سے صاف کہدیا تھا کہ تمہارے لئے نجات کی صورت بس یہی ہے کہ میری بھیجی ہوئی ہدایت کا اتباع کرو۔ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۔ (۲ : ۴) پھر اس نے یہ بھی فرما دیا تھا کہ یہ ہدایت ہر شخص کے پاس فرداً فرداً نہیں بھیجی جائے گی، بلکہ میں خود تم ہی میں سے کچھ لوگوں کو انتخاب کر کے ان پر اپنی ہدایت نازل کرونگا اور ان کو تمہارے پاس رسول بنا کر بھیجونگا۔ جو شخص میرے رسول کو اور اس کے لائے ہوئے پیغام کو سچے

دل سے مانیگا وہی ہدایت پائیگا: يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۷: ۴) اور جو رسولوں کو نہ مانیگا وہ اس کی سزا پائیگا۔ اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ (۳۸: ۱) اور جب قیامت کے روز اس کو عذاب دیا جائیگا تو اس سے کہا جائیگا کہ کیا تمہارے پاس رسول نہیں آئے تھے اور انہوں نے تم کو خدا کی آیات نہیں سنائی تھیں، اور اس دن کے انجام سے آگاہ نہیں کر دیا تھا؟ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا (۳۹: ۸)

اس کے ساتھ ہی قرآن مجید صاف کہتا ہے کہ جو شخص اللہ کے رسولوں کو نہ مانے اس کے لئے اللہ کو ماننا ہرگز نافع نہیں ہے:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا (۴: ۲۱)

تحقیق جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لائیں گے اور بعض کا انکار کریں گے اور چاہتے ہیں کہ اس کے بیچ کی کوئی راہ اختیار کریں، وہ لوگ یقیناً کافر ہیں۔

قرآن کے نزدیک مومن وہی ہے جو اللہ کے ساتھ اس کے رسول پر بھی ایمان لائے:۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (۲۴: ۹)

مومن در اصل وہی ہیں جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔

---

[1] واضح رہے کہ رسول کی تکذیب یہی ہے کہ اس کے دعوئی رسالت کو ماننے سے انکار کیا جائے۔ یہ انکار خواہ نیک نیتی سے ہو یا بدنیتی سے بہرحال انکار ہی، البتہ بدنیتی کی صورت میں انکار کی ذمہ داری زیادہ بڑھ جاتی ہے جو شخص غلط راستہ کو صحیح سمجھ کر اختیار کرے وہ گمراہ ہے اور جو صحیح راستہ کو صحیح جانتے ہوئے غلط راستہ پر چلے وہ گمراہی کے ساتھ مغضوب بھی ہے، چنانچہ سورۂ فاتحہ میں واضح کر دیا گیا ہے۔ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۔

اور جو شخص رسول کے ذریعہ سے ہدایت کا راستہ واضح ہو جانے کے بعد بھی، اس کو اختیار کرنے سے انکار کرے وہ جہنم سے بچ نہیں سکتا۔ اس معاملہ میں نیک نیتی اور بدنیتی کا قطعاً کوئی سوال نہیں ہے۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (۴: ۱۱۵)

اور جو شخص ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد بھی رسول سے جھگڑا کرے اور مومنوں کے راستے پر چلے اس کو ہم اسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونک دیں گے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

یہ بات قرآن مجید کی تعلیم کے اصول سے ہے، اور قرآن میں آپ کہیں ایسی کوئی بات نہیں پا سکتے جو اس کے خلاف ہو۔ آپ نے جن آیات کو سیاق و سباق سے الگ کر کے پیش فرمایا ہے وہ بظاہر آپ کو اس سے متناقض معلوم ہوتی ہیں لیکن اگر آپ سورۂ آل عمران کو چھٹے رکوع سے لے کر بارھویں رکوع تک مسلسل پڑھیں تو تناقض کا شائبہ تک نہ رہے گا۔ چھٹے رکوع میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا ..... ثُمَّ نَبْتَهِلْ

یہ علم حق تیرے رب کی طرف سے ہے لہذا تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جائیو۔ پھر جو کوئی اس کے بارے میں تجھ سے حجت کرے جب کہ تیرے پاس علم آچکا ہے تو کہہ کہ آؤ..... پھر ہم مباہلہ کریں۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ اہل کتاب کو ایک کلمۂ سواء یعنی توحید کی طرف دعوت دو اور ان سے کہو کہ ابراہیمؑ جس کے بارے میں تم جھگڑتے ہو وہ یہودی یا نصرانی نہ تھا، اور اس کے ساتھ اصلی تعلق وہی لوگ رکھتے ہیں جو اس کا اتباع کرتے ہیں۔ پھر فرمایا گیا کہ تم کسی کی بات نہ مانو بجز اس کے جو تمہارے دین کی پیروی کرے وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ اس کے بعد ارشاد ہوا ہے کہ تمام پیغمبروں سے (اور بالتبع ان کی امتوں سے) عہد لیا گیا ہے کہ ہر نبی جو خدا کی طرف سے تمہاری کتابوں کی

تصدیق کرنے کے لئے آئے اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا اس عہد سے جو لوگ پھر جائیں وہ فاسق ہیں آگے
چل کر ارشاد ہوتا ہے کہ ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے نبیوں پر جو کچھ اترا ہے اس سب
پر ایمان لاؤ یہی اسلام ہے اور جو شخص اس اسلام کے سوا کسی اور دین کا خواہاں ہو، اس کا وہ دین ہرگز مقبول
نہ ہوگا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھائے گا "وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَ
هُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ۔ آخر میں اہل کتاب کے متعلق فرمایا جاتا ہے کہ وَلَوْ آمَنَ
أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُم۔ اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا مِّنْهُمُ
الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ" ان میں سے تھوڑے ایمان لائے اور اکثر نافرمان ہیں"۔ اس
آیت سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں ایمان سے مراد رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان ہے۔ کیونکہ جو لوگ "اہل
کتاب" ہیں وہ موسیٰ یا عیسیٰ علیہما السلام کو یا دونوں کو اور ان کی لائی ہوئی کتابوں کو تو مانتے ہیں، اور خدا کے
بھی قائل ہیں۔

آخری آیت جو سورۂ حدید سے آپ نے نقل فرمائی ہے، اس میں ان تمام لوگوں کو جو پچھلے انبیاء پر ایمان
لا چکے ہیں، دو چیزوں کی دعوت دی گئی ہے۔ ایک یہ کہ خدا سے ڈریں اور تقویٰ اختیار کریں۔ دوسرے یہ کہ خدا
کے رسول یعنی محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں، پھر فرمایا گیا کہ اگر تم یہ دونوں باتیں اختیار کروگے تو تم کو
خدا کی رحمت سے دو حصے ملیں گے، یعنی ایک حصہ انبیاء سابقین پر ایمان اور تقویٰ کے اجر میں اور دوسرا حصہ
ایمان بر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اجر میں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ تقویٰ اور پرہیزگاری کے ساتھ
پچھلے انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کی دی ہوئی تعلیم پر ٹھیک ٹھیک عامل ہیں ان کو بھی خدا کی رحمت کا
ایک حصہ ملے گا۔ اس کی تائید دوسری آیات سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً وَالَّذِينَ يُمَسِّكُونَ بِالْكِتَابِ وَ
أَقَامُوا الصَّلَاةَ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُصْلِحِينَ (۷: ۲۱) اور يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ
عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ (۵: ۱۰)۔

لیکن ایک دوسرے موقع پر یہ بھی تو فرمایا ہے۔
اَفَمَنۡ یَّعۡلَمُ اَنَّمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ الۡحَقُّ کَمَنۡ ہُوَ اَعۡمٰی (۱۳:۱۳)۔ کیا وہ شخص جو جانتا ہے کہ جو کتاب تیرے اوپر آماری گئی ہے وہ حق ہے، اُس شخص کے مانند ہو سکتا ہے جو اندھا ہے۔

اور یہ بھی تو ارشاد ہوا ہے کہ لوگ پچھلی کتابوں کا صحیح علم رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ قرآن خدا کی طرف سے آیا ہے اور برحق ہے۔ وَالَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یَعۡلَمُوۡنَ اَنَّہٗ مُنَزَّلٌ مِّنۡ رَّبِّکَ بِالۡحَقِّ (۶:۴)
لہٰذا ان دونوں مضمونوں کی آیتوں کو ملانے سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ جو لوگ جہالت اور نابینائی کے باعث رسول عربی کی صداقت کے قائل نہیں ہیں۔ مگر انبیاء سابقین پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور تقوی و صلاح کی زندگی بسر کرتے ہیں ان کو اللہ کی رحمت کا صرف اتنا حصہ ملیگا کہ ان پر عذاب میں تخفیف ہو جائے گی۔ واللہ اعلم بالصواب

تقریظ وانتقاد

تعلیمات قرآن

(۲)

نظامِ عالم کی مدت صفحہ ۶۲ پر یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۳۲ : ۱) اور تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ (۷۰ : ۱)۔ کی تفسیر کرتے ہوئے حاشیہ پر لکھتے ہیں۔

"نزولِ امر اور عروجِ امر سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا آغاز و انجام مراد ہے اور جملہ امور کے خاتمہ کی مدت پچاس ہزار سال ہے۔ یعنی نظام عالم کے قیام کی مدت پچاس ہزار سال ہے جس کے بعد قیامت آجائے گی۔"

یہ تفسیر قریب قریب وہی ہے جو ابو مسلم اصفہانی سے منقول ہے؛ لیکن قرآن مجید سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ دونوں آیتوں کے الفاظ میں کوئی خفیف سا اشارہ بھی اس جانب نہیں ہے کہ نظام عالم کی مدت قیام ۵۰ ہزار سال ہے۔ نیز جہاں تک غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، ان دونوں آیتوں میں کوئی ایسا ربط بھی نہیں ہے کہ ان کو ملا کر کوئی نتیجہ اخذ کیا جاسکے۔ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے تدبیر امر کا ذکر فرمایا ہے کہ وہ آسمان سے زمین تک دنیا کا انتظام کرتا ہے اور اس انتظام کا عروج اس کی جانب ایک دن میں ہوتا ہے جو تمہارے حساب سے ہزار سال کے برابر ہے۔ اس تدبیر امر کی کیفیت، اور ایک ایسے طویل دن میں اسکا عروج ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اگر اس کی تفصیل ہمارے سامنے بیان کی بھی جاتی تو ہم اس کو نہ سمجھ سکتے،

البتہ یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو کچھ فرمایا گیا ہے موجودہ نظام عالم کی تدبیر کے باب میں ہے بخلاف اس کے دوسری آیت میں جس دن کا ذکر ہے وہ اِس نظام کے خاتمہ کا دِن یعنی قیامت ہے۔ چنانچہ پوری آیت کے الفاظ ملاحظہ ہوں

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الخ

پوچھنے والے نے پوچھا اس عذاب کے بارے میں جو کافروں کے لئے واقع ہونے والا ہے۔ اس کو تو کوئی دفع کرنے والا نہیں۔ وہ بلند مراتب والے خدا کی طرف سے ہے۔ ملائکہ اور روح اس کی طرف چڑھیں گے ایک ایسے دن میں جس کی مقدار ۵۰ ہزار برس ہوگی پس اے محمد تو ان کی باتوں پر اچھی طرح صبر کر۔ یہ اس دن کو دور دیکھ رہے ہیں اور ہم قریب دیکھتے ہیں۔ وہ ایسا دن ہوگا کہ آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو جائے گا۔ اور پہاڑ رنگ برنگ کے اون کی طرح اڑتے پھریں گے۔

اس آیت کی تفسیر میں تمام بڑے بڑے مفسرین مثل عکرمہ و قتادہ و ضحاک و ابن زید و ابن عباس سے بھی یہی منقول ہے کہ اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے اور وہ دن کافروں کے لئے ایسا طویل ہوگا جیسے ۵۰ ہزار برس۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ سے عرض کیا گیا کہ یہ تو بڑا ہی لمبا دن ہوگا! حضور نے فرمایا کہ "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، مومن پر وہ اتنا خفیف ہو جائیگا جتنا دنیا میں ایک فرض نماز پڑھنے کا وقت ہوتا ہے"!

اسلام اور ایمان کا فرق صفحہ ۴۷ پر قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (۴۹: ۲)۔ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"اسلام اور ایمان میں ظہور اور بطون کا فرق ہے۔ اللہ نے ظہور کی بنیاد پر ہمارا نام مُسلم رکھا ہے جس کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے بخلاف اس کے جو لوگ اپنے آپ کو مومن کہتے

ہیں وہ لطون یعنی ایمان کے جی ہیں جس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں اس لئے یہ نام تزکیۂ نفس کا ادعا ہے جس سے ممانعت کی گئی ہے۔

اس تفسیر سے دو غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ "اسلام" ایمان کے بغیر بھی متحقق ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی مسلمان کا اپنے آپ کو مومن کہنا خلاف حکم قرآن ہے۔ یہ دونوں باتیں آیت مذکورہ کے معنی اور سیاق و سباق پر غور نہ کرنے کا نتیجہ ہیں۔ وہاں دراصل "اسلام" اپنے اصطلاحی معنوں میں نہیں بلکہ لغوی معنوں میں آیا ہے۔ اس کے مخاطب اہل بادیہ (یعنی اعراب) ہیں جو پوری طرح اسلام کو نہیں سمجھتے تھے، اور صرف اس کے سیاسی تعلق سے مرعوب ہو کر مطیع ہو گئے تھے۔ ان سے فرمایا گیا ہے کہ "تم اپنے آپ کو مومن نہیں کہہ سکتے صرف مسلم (مطیع) کہہ سکتے ہو کیونکہ ابھی تک تمہارے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا ہے۔ تم لوگ اگر اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی اطاعت کرو گے تو اس کا اجر تم کو حق کے مطابق ضرور ملے گا۔ مگر سچے مومن تو دراصل وہی ہیں جن کے دل میں اللہ کی یکتائی اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر پورا پورا یقین موجود ہے، کسی قسم کا شک و شبہ نہیں اور جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں۔" ان الفاظ سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں جس اسلام کا ذکر ہے وہ محض اس اطاعت کے معنی میں ہے جو ایمان کے بغیر حاصل ہو گئی ہے لیکن عام طور پر قرآن مجید نے "اسلام" کی اصطلاح جس معنے میں استعمال کی ہے۔ وہ ایمان اور اطاعت دونوں کو شامل ہے۔ اسلام کی حقیقت، ایمان کے بغیر متحقق ہی نہیں ہوتی، اور "مسلم" ہی نہیں کہا جا سکتا جو مومن نہ ہو۔ کیونکہ "اسلام" خدا کا "دین" ہے، اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (۳: ۲) اور خدا کا دین جوارح سے پہلے قلب کی اطاعت چاہتا ہے۔ بس اس معنی میں جو شخص "مسلم" ہے وہ سب سے پہلے "مومن" ہے اور اس کو ایمان کا دعوی کرنے سے ہرگز منع نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ اس دعوی کی صریح اجازت موجود ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ وَاللّٰہُ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اِنَّنَا اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ الصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ (۳: ۲)۔ رہا وہ استدلال

جو جناب مولف نے فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ سے کیا ہے تو وہ کسی طرح درست نہیں، کیونکہ یہ ارشاد جس موقع پر ہوا ہے وہاں تو یہ بتایا گیا ہے کہ حق تعالیٰ جس نے تم کو پیدا کیا ہے، تمہاری کمزوریوں سے خوب واقف ہے۔ اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرو تو تمہارا رب جو "واسع المغفرت" ہے تمہارے چھوٹے چھوٹے گناہوں کو بخش دیگا۔ لہٰذا تم اپنے نفس کی پاکیزگی نہ جتاؤ۔ خدا خوب جانتا ہے کہ کون کتنا متقی ہے (ملاحظہ ہو سورہ نجم رکوع دوم)۔

عقیدۂ تقدیر صفحہ ۵۷ پر اجزار ایمان بیان کرتے ہوئے حاشیہ پر فرماتے ہیں کہ:۔

"قرآن میں ایمان کے صرف یہی پانچ اجزار ثابت ہوتے ہیں۔ تقدیر قرآنی مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے۔ عقائد میں داخل نہیں"

یہ عبارت اس قدر مبہم ہے کہ پوری طرح مولف کا مطلب ظاہر نہیں ہوتا ہم نہیں کہہ سکتے کہ "قرآنی مسائل" سے مولف کی مراد کیا ہے؟ اور تقدیر کے مسئلہ کو عقائد سے خارج کرنے کا کیا مطلب ہے؟ تاہم اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جناب مولف کی رائے میں عقیدۂ تقدیر جزر ایمان نہیں ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہم کہیں گے کہ جناب مولف نے اس مسئلہ کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ عقیدۂ تقدیر منجملہ ان عقاید کے ہے جو ایمان باللہ کے اجزار ہیں۔ جس طرح خدا کے سمیع، بصیر، علیم، خالق اور رزاق وغیرہ ہونے پر اعتقاد رکھنا جزر ایمان ہے، اسی طرح یہ اعتقاد بھی جزر ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے امر اور اس کی قضار اور مشیت کے خلاف کسی شے اور کسی فعل کا صدور نہیں ہو سکتا اور نہ اگر صفات الٰہی میں سے ہر ہر صفت کے بیان کو قرآنی مسائل میں سے ایک مسئلہ کہہ کر عقائد سے خارج کر دیا جائے تو پھر ایمان باللہ کس چیز کا نام رہ جائیگا؟ ایمان باللہ تو انہی تفصیلات کے مجموعہ کا نام ہے جو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور افعال کے متعلق بیان کی گئی ہیں۔ ان سے قطع نظر کر کے صرف خدا کے وجود اور اس کی یکتائی پر ایمان لانا ہرگز کافی نہیں ہے۔

علماء و صلحا کا اتباع صفحہ ۸۳ پر تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"شرک کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ علماء اور صلحار کو امام اور ہادی مان کر ان کے

اقوال کو اللہ کے قول کی طرح بلا سند تسلیم کرنا"!

اس پر حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ

ائمہ سلف اور بزرگان دین کے علوم اور حالات سے علمی اور تاریخی فائدے حاصل کئے جا سکتے ہیں لیکن ان کے کسی قول کو بلا قرآنی سند کے دین ماننا شرک ہے۔"

پھر صفحہ ۱۰۲ پر لکھتے ہیں کہ "کتاب اللہ کو چھوڑ کر بزرگوں کی پیروی کرنا گمراہی ہے" اور صفحہ ۱۵۲ پر تحریر فرماتے ہیں کہ "رسول اور امیر کی اطاعت کے سوا اور کسی کی اطاعت کا حکم قرآن میں نہیں ہے بلکہ ممانعت ہے"۔ اور صفحہ ۴ ۵ ا پر فرماتے ہیں "بلکہ عام طور پر انسانوں کی اطاعت کو قرآن خطرناک قرار دیتا ہے"۔

یہ سب کچھ تشدد پر مبنی ہے مسلمانوں میں جاہل پیروں اور نفس پرست علماء سوء کی اندھی تقلید اور جاہلانہ اطاعت کے جو آثار نظر آتے ہیں ان پر جتنا بھی اظہار غضب کیا جائے، جائز اور بجا ہے لیکن افسوس ہے کہ مؤلف نے شدت غیظ میں علماء حق اور صلحاء امت اور ائمہ ھداۃ کی اطاعت اور پیروی کو بھی گمراہی قرار دے دیا ہے، اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس کو شرک تک کہدیا حالانکہ اگر وہ انہی آیات قرآنی پر غور فرماتے جن کو انہوں نے استدلال میں پیش کیا ہے، تو انہیں خود احساس ہو جاتا کہ وہ حق سے بہت کچھ تجاوز کر گئے ہیں شرک جس چیز کا نام ہے وہ تو بغیر اس کے متحقق نہیں ہو سکتی کہ کوئی شخص خدا کے سوا کسی دوسرے کو حقیقی معنوں میں آمر اور ناہی قرار دے، یا خدا کے امر و نہی کے مقابلہ میں یا اس کے برابر کسی اور کے امر و نہی کو واجب الاطاعت سمجھے۔ لیکن یہ مخفی نہیں ہے اور غالباً جناب مؤلف خود بھی جانتے ہونگے کہ کوئی جاہل سے جاہل مسلمان بھی ایسا اعتقاد نہیں رکھتا۔ لہذا اس معاملہ میں شرک کا تو شائبہ بھی نہیں ہے۔ جو شخص کسی کے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ وہ خدا کا مقرب ہے اور اس کی شریعت اور اس کے احکام کو دوسروں کی بنسبت زیادہ بہتر جانتا ہے وہ اگر اس کی پیروی یہ سمجھ کے کرے کہ اس کی پیروی 'رضائے الٰہی کی پیروی ہے' تو اس پر شرک کا فتویٰ لگانا

صریح ظلم ہوگا۔ اب رہ گیا یہ سوال کہ کس کا اتباع کرنا جائز ہے، اور کس کا اتباع گمراہی ہے۔ تو قرآن مجید صاف کہتا ہے کہ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ (۱:۲۳) وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (۱۸:۴) فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ (۱:۲۸) وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا (۲:۷۶) یعنی کافروں اور منافقوں اور خدا کو بھول جانے والوں اور ہوائے نفس کی پیروی کرنے والوں، اور افراط پسندوں، حق کو جھٹلانے والوں اور گناہ گار ناشکروں کی پیروی نہ کرو۔ یہ کہیں بھی نہیں کہا گیا ہے کہ صالحین اور اہل علم کی پیروی نہ کرو۔ بلکہ قرآن تو کہتا ہے کہ فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۶:۱۶) اور اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (۶:۱۰) یعنی اگر تم نہیں جانتے تو جاننے والوں سے پوچھو، اور جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے ان کے راستے کی پیروی کرو۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، مولف نے صحیح اور غلط کو خلط ملط کر دیا ہے، اور اسی افراط پسندی کی رو میں بہ گئے ہیں جو آج کل کے تجدد پسند حضرات میں پائی جاتی ہے۔ علماء اور صلحاء کرام کو ہادی ماننا کوئی گناہ نہیں ہے بلکہ غیر عالم اور غیر صالح کے لئے ان کی امامت و ہدایت کو قبول کرنا لازم ہے البتہ ان کے قول کو اللہ کے قول کی طرح سمجھنا ضرور گناہ ہے۔ اسی طرح یہ درست ہے کہ کتاب اللہ کو چھوڑ کر بزرگوں کی پیروی کرنا گمراہی ہے لیکن جو شخص یہ سمجھ کر بزرگوں کی پیروی کرے کہ وہ خود کتاب اللہ کا علم نہیں رکھتا اور بزرگان سلف نے جو طریقے اختیار کیے ہیں وہ کتاب اللہ کے مطابق ہیں، تو اس کو کسی طرح گمراہ نہیں کہا جا سکتا زیادہ سے زیادہ آپ جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ صرف اس قدر ہے کہ اس نے پیروی کے لئے جن بزرگوں کو چن لیا ہے ان کا انتخاب درست نہیں ہے۔ آپ تقلید جامد اور اندھی پیروی کی جتنی چاہیں برائی کر سکتے ہیں یہ سب بجا اور درست آپ یہ کہنے کا حق بھی رکھتے ہیں کہ ولایت، امامت، اجتہاد اور علم و فضیلت بزرگوں پر ختم نہیں ہو گئیں آج بھی یہ سب مراتب حاصل ہو سکتے ہیں، اور ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے لیکن تقلید کی مخالفت اور اجتہاد کا شوق اگر اس حد تک پہنچ جائے کہ بزرگان سلف کے خلاف ایک ضد سی پیدا ہو جائے، اور ان کی بنائی ہوئی عمارتوں کو خواہ مخواہ

ڈھادینا ہی ضروری سمجھ لیا جائے، اور محض نئی بات پیدا کرنے کی خاطر جدت طرازیاں کی جائیں، اور لوگ اہلیت کے بغیر امامت اور اجتہاد کے منصب پر متمکن ہونے کی کوشش کریں، اور کتاب اللہ وسنت رسول کو بازیچۂ اطفال بنائیں تو یہ گمراہی پہلی گمراہی سے بھی زیادہ سخت ہوگی۔ اور اس ذہنیت کے ساتھ جس قوم کی تعمیر کی جائے گی اس کی تعمیر عین تخریب ہوگی۔ مقلدین تو صرف اتنا کرتے ہیں کہ جو دیواریں ان کے اسلاف اٹھا گئے ہیں ان کو بجنسہ رہنے دیتے ہیں اور ان پر کوئی اضافہ نہیں کرتے لیکن تجدد پسند حضرات ضروری سمجھتے ہیں کہ پچھلی دیواروں کو ڈھا کر خود نئی دیواریں اٹھائیں۔ اور اس ذہنیت کا مقتضیٰ یہی ہے کہ ہر نئے دور والے پچھلے دور والوں کی اٹھائی ہوئی دیواروں کو ڈھا کر نئی دیواریں اٹھایا کریں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی عمارت بننے ہی نہ پائے گی اور ہدم وتعمیر کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری رہے گا۔

علم غیب رُسُل

صفحہ ۱۲۶ پر لکھا ہے۔

> "رسول کو عالم غیب سے وہی باتیں بتائی جاتی ہیں جن کو اللہ ان کے توسط سے اپنے بندوں کے پاس بھیجنا چاہتا ہے۔"

استدلال میں یہ آیت پیش کی ہے:

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا	وہ غیب کا عالم ہے، اور وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا
اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ	البتہ جس رسول کو پسند کرتا ہے اسے غیب سے باخبر کر دیتا
مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ رَصَدًا لِيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا	ہے تاکہ اس کو معلوم ہو جائے کہ انہوں نے اپنے رب کے
رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ (۷۲: ۲)۔	پیغام پہونچا دیے۔

مگر یہ آیت اس مفہوم کی تصریح نہیں کرتی جو مؤلف نے اس سے اخذ کیا ہے۔ آیت کے آخری ٹکڑے کا مفہوم مختلف فیہ ہے۔ بعض کے نزدیک لِيَعْلَمَ کا فاعل خدا ہے اور بعض کے نزدیک رسول۔ اسی طرح قَدْ اَبْلَغُوْا کے متعلق بھی اختلاف ہے کہ اس سے مراد آیا وہ فرشتے ہیں جو خدا کے پیغامات رسول کے پاس لاتے ہیں۔

یا خدا کے پیغمبر ہیں۔ تاہم اگر اس فقرہ کا یہ ترجمہ بھی کیا جائے کہ خدا اپنے رسول کے آگے اور پیچھے نگہبان مقرر کر دیتا ہے تاکہ خدا کو معلوم ہو جائے کہ رسول نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے۔ تب بھی اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ رسولوں کو عالم غیب کی صرف وہی باتیں بتائی جاتی ہیں جو اللہ تعالیٰ ان کے واسطے سے اپنے بندوں کو بتانا چاہتا ہے۔ کیونکہ اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ غیب کے متعلق عام بندوں کا علم رسولوں کے علم کے برابر ہے، اور رسولوں کو اس سے زیادہ کچھ نہیں بتایا گیا جو بندوں کو بتایا گیا ہے۔ حالانکہ خود قرآن مجید میں حضرت یعقوب کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ آپ نے اپنے بیٹوں سے فرمایا اِنِّی اَعْلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۱۲: ۱۱) میں خدا کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے علاوہ بریں قرآن مجید کے بکثرت مقامات سے معلوم ہوتا ہے، کہ قوموں پر عذاب بھیجنے سے پہلے ان کے نبیوں کو خبریں دیدی گئیں اور انہوں نے عذاب کے وقت اور اس کی تفصیلی کیفیت سے اپنی قوم کو مطلع نہ کیا حضرت نوح علیہ السلام کو تو اس سے پہلے عذاب کی خبر دیدی گئی تھی کہ انہوں نے طوفان آنے سے پہلے کشتی بنالی خود نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کے ایسے ایسے حالات بتائے گئے تھے جو آپ کی امت کو نہیں بتائے گئے۔ چنانچہ ایک مرتبہ خطبہ دیتے ہوئے حضور نے ارشاد فرمایا کہ یا امۃ محمد واللہ لو تعلمون ما اعلم لضحکتم قلیلا ولبکیتم کثیرا۔ (بخاری۔ باب الصدقۃ فی الکسوف)۔ اے محمد کی قوم! خدا کی قسم اگر تم کو وہ باتیں معلوم ہوتیں جو میں جانتا ہوں تو تم کم ہنستے اور بہت روتے ایک اور موقع پر حضور نے فرمایا کہ۔ انی لاراکم من ورائی کما اراکم (بخاری باب عظمۃ امام الناس) میں تم کو پیچھے سے بھی ایسا ہی دیکھتا ہوں جیسا سامنے سے دیکھتا ہوں۔ غرض بکثرت آیات اور روایات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ رسولوں کو علم غیب دیا گیا تھا وہ اس سے بہت زیادہ تھا جو ان کے واسطے سے بندوں تک پہنچا اور عقل بھی یہی چاہتی ہے کہ ایسا ہو۔ کیونکہ بندوں کو تو غیب کی صرف وہی باتیں معلوم ہونے کی ضرورت ہے جن کا تعلق عقائد ایمانیہ سے ہے لیکن رسولوں کو ان کے سوا اور بہت سی ایسی معلومات بھی حاصل ہونی چاہئیں جو فرائض رسالت انجام دینے میں ان کے لئے مددگار ہوں جس طرح سلطنت کی پالیسی اور اس کے

اسرار سے وائسرائے اور گورنروں کا ایک خاص حد تک واقف ہونا ضروری ہے اور عام رعایا تک ان رازوں کا پہنچ جانا بجائے مفید ہونے کے الٹا مضر ہوتا ہے۔ اسی طرح ملکوت الٰہی کے بھی بہت سے اسرار ہیں جو خدا کے خاص نمائندے اور اس کے خلفاء جانتے ہیں اور عام رعیت ان سے بے خبر ہے۔ یہ علم غیب ان خلفاء کو تو اپنے فرائض انجام دینے میں مدد دیتا ہے لیکن عام رعایا کے لئے اس علم کی نہ ضرورت ہے اور نہ وہ اس کی متحمل ہو سکتی ہے۔

متفرق مسائل مذکورہ بالا امور کے علاوہ کتاب میں چند چھوٹی چھوٹی لغزشیں بھی ہیں۔ چونکہ اس تنقید کا مقصد خوردہ گیری نہیں ہے اس لئے ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے لیکن ان میں سے بعض کی طرف فاضل مولف کی توجہ منعطف کرانا ضروری ہے۔ مثلاً۔

متعدد مقامات پر استوا علی العرش کا ترجمہ عرش پر بیٹھنا کیا گیا ہے۔ یہ درست نہیں ہے۔ اول تو حق تعالیٰ کے لئے "بیٹھنے" کا لفظ استعمال کرنے میں تشبیہ و تجسیم کا اندیشہ ہے۔ دوسرے خود لغت کی رو سے بھی لفظ استوا جلوس کا ہم معنی نہیں۔ جب استوا کے لئے علیٰ کا صلہ آتا ہے تو اس کے معنی استیلا یعنی چھا جانے اور غالب ہو جانے کے ہوتے ہیں۔ پس اگر عرش سے کوئی مادی تخت نہیں بلکہ زمین و آسمان اور کل جہان کی حکومت مراد لی جائے تو اس پر مستوی ہونے کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ تمام عالم کی فرمانبروائی پر چھایا ہوا ہے۔

صفحہ ۲۷ پر سات آسمانوں اور سات زمینوں کا حساب سمجھانے کی کوشش کی ہے اس میں شک نہیں کہ بات لگتی ہوی ہے اور جس طریقے سے انھوں نے سمجھایا ہے اس سے وہ اعتراضات رفع ہو جاتے ہیں جو نئے زمانے کے اہل ہیئت کی طرف سے کئے جاتے ہیں لیکن ہمارا خیال ہے کہ قرآن مجید کے ایسے بیانات کو کسی عہد کے علوم و نظریات سے مطابق کرنے کی سعی کرنا اصولاً صحیح نہیں ہے زیادہ بہتر یہی ہے کہ ان مسائل میں سکوت اختیار کیا جائے اور ایسی آیتوں کے معنی و مفہوم کو دلالت لفظی سے تجاوز کر کے قیاس و تاویل کے ساتھ متعین کرنے کا طریقہ قطعاً ترک

کر دیا جائے۔ اسی طرح آسمانوں کے طبق بر طبق ہونے اور ان کے محفوظ ہونے کو ہیئت کی جدید معلومات کے لحاظ سے سمجھانے کی جو کوشش صفحہ ۲۰ پر کی گئی ہے اور واللہ انبتکم من الارض نباتاً اور وقد خلقکم اطواراً سے نظریۂ ارتقا کی طرف جو اشارہ کیا گیا ہے اس سے بھی احتراز واجب تھا۔ پرانے زمانے کے علماء یہ غلطی کر چکے ہیں کہ قرآن مجید کو انھوں نے قدیم فلسفہ اور ہیئت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی اور اس زمانے کے بندگان عقل کو مطمئن کرنے کے لئے قرآن کو ارسطو اور افلاطون اور بطلیموس کے نظریات پر منطبق کرڈالا لیکن موجودہ دور کے نظری اور تجربی علوم نے جب پچھلے نظریات کو باطل کر دیا تو وہ تمام تاویلیں جو پہلے کی گئی تھیں غلط ثابت ہوئیں، اور وہ تمام سہارے ٹوٹ گئے جن پر قرآن مجید کی تاویل کا مدار رکھا گیا تھا پھر سید احمد خانی دور میں دوبارہ اسی غلطی کا اعادہ کیا گیا۔ مگر سائنس کی جدید ترقیات نے ان سہاروں میں سے بھی بہتوں کو توڑ دیا جن پر سید مرحوم اور ان کے متبعین نے تاویل کی عمارت قائم کی تھی۔ ان تجربات سے ہم کو سبق لینا چاہئے اور یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ قرآن کے لئے انسانی علوم کے سہاروں کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں۔ اس کتاب میں تو فاطر السموٰت والارض کا علم ہے جو ظن اور تخمین نہیں بلکہ علم حق اور عین حق ہے یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ اس کی کوئی بات غلط ہو ہاں ممکن ہے کہ اس کی بعض باتیں ہمارے اس وقت کے علوم (یا صحیح معنوں میں ظنون) اور نظریات کے خلاف ہوں، لیکن اس کی کسی بات کا ان کے خلاف ہونا اس کے غلط ہونے کی دلیل نہیں ہے ہو سکتا ہے کہ کل جب علم کی مزید روشنی ہم کو حاصل ہو تو خود ہمارا یہ نظریہ ہی بدل جائے، ہم پر کچھ مزید حقائق منکشف ہوں اور اس وقت ہم کو اس بات کے صحیح معنی معلوم ہو جائیں جو قرآن میں ارشاد ہوئی ہے۔

اب چند اہم مسائل باقی رہ گئے ہیں جن میں ہم کو فاضل مؤلف سے بشدت اختلاف ہے۔ ان پر انشاء اللہ آیندہ صحبت میں گفتگو کی جائے گی۔ (باقی آیندہ)

مطبوعات

قرآن کریم اور ایک غلط فہمی کا ازالہ از خان بہادر حاجی رحیم بخش ایم اے ضخامت ۳۲ صفحات قیمت درج نہیں۔ غالباً حاجی صاحب نے افادۂ عام کی غرض سے شایع کی ہے۔

ملنے کا پتہ :- ۱۱ فرید کورٹ روڈ۔ لاہور۔

عام خیال ہے۔ اور جتنا عام ہے۔ اتنا ہی جاہلانہ اور بے بنیاد ہے کہ "قرآن مجید کی موجودہ ترتیب بذریعہ وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے عمل میں نہیں آئی" یہ خیال احادیث وآثار سے بے خبری اور فتنہ پردازیوں کی فتنہ پردازیوں نے پیدا کیا اور عام کیا۔ احادیث وآثار سے ثابت ہے اور اس میں کسی شک وشبہ کی مطلق گنجایش نہیں ہے، کہ قرآن حکیم اول سے آخر تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک میں لکھا اور مرتب کیا جاچکا تھا حتٰی کہ سورتوں کے نام بھی آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی نے مقرر فرمائے تھے۔ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو بارہا اعادہ کرتے سماعت فرمایا تھا۔ اور وہی قرآن جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہد میں لکھا اور مرتب کیا گیا تھا۔ آج ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

اردو میں اس موضوع پر مولانا مفتی عبداللطیف صاحب رحمانی مونگیری استاذ جامعہ عثمانیہ کی محققانہ کتاب "تاریخ القرآن" پہلی اور بہترین کتاب ہے۔ اور اس جاہلانہ خیال کی قاطع ہے۔

جناب حاجی رحیم بخش صاحب نے نئے اسلوب سے، جو ان کے فہم وتدبر پر دلالت کرتا ہے، خود کلام اللہ ہی سے اس جاہلانہ خیال کا رد کیا ہے اور جناب مفتی صاحب سے ایک قدم آگے بڑھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن کریم کی ترتیب منجانب اللہ ہے۔

رسائل ادارۂ اصلاح نوجوانان، سیالکوٹ از پروفیسر حکیم عبدالحمید صاحب سیالکوٹ۔

حکیم عبدالحمید صاحب اور ان کے احباب نے "ادارۂ اصلاح نوجوانان" کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی جو اب سیالکوٹ منتقل ہوگئی ہے اس ادارہ کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان نوجوانوں کو عموماً اور کالجوں میں تعلیم پانے والے مسموم نوجوانوں کو خصوصاً تاریخ اسلام و دین اسلام سے آگاہ اور صحیح اسلامی ذہنیت سے آشنا کیا جائے۔ چنانچہ اس غرض سے حکیم صاحب نے درس قرآن و دعوت اسلام و تقابل ادیان کی تعلیم و تدریس کا اہتمام کیا ہے اور اسی سلسلہ میں افادۂ عام کی غرض سے مندرجۂ ذیل رسائل شائع کئے ہیں۔ مذہب، معیار مذہب، دعوت عمل۔ اخلاق نبوی۔ الاسلام، صداقت اسلام۔ یہ تمام رسالے مفید مضامین پر مشتمل ہیں۔ جو اصحاب مطالعہ کرنا چاہیں چار آنے کے ٹکٹ بھیج کر طلب فرمالیں۔

قاسم العلوم | مرتب:۔ مولوی عتیق احمد صاحب صدیقی حجم ۳۲ صفحات قیمت سالانہ عہ ۸ رر رعایتی قیمت عہ دفتر قاسم العلوم دارالعلوم دیوبند، ضلع سہارنپور۔

دارالعلوم دیوبند سے ایک زمانے میں "القاسم" اور "الرشید" نامی رسالے نکلتے تھے "القاسم" بھی زمانہ دراز تک علم کی خدمت انجام دیتا رہا ہے۔ اب ان رسالوں کی جگہ "قاسم العلوم" نے لی ہے۔ دو نمبر ہماری نظر سے گذر چکے ہیں۔

ضرورت تھی کہ دارالعلوم دیوبند سے ایسا رسالہ جاری ہوتا جو نہ صرف اس کے علوم و معارف کا حامل ہوتا بلکہ بحالات موجودہ علمی حیثیت سے مسلمانان ہند کی رہنمائی کا فرض بھی انجام دیتا۔ قاسم العلوم کے لائق مرتب کی خدمت میں ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ رسالہ کو بہتر سے بہتر اور بلند سے بلند بنانے کی کوشش کریں کہ حضرت قاسم العلوم علیہ الرحمۃ کی مناسبت، اور دارالعلوم کی شاندار علمی روایات کا یہی اقتضا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اتنی کم قیمت میں زیادہ ضخامت اور بلند معیار کا رسالہ طیار نہیں ہوسکتا۔ لیکن کیا ضرورت ہے کہ رسالہ کو عام پسند بنانے کے لئے اپنے معیار کو پست کیا جائے آج کل عام پسندی تو فلمی اور افسانوی رسالوں کے حصہ میں آچکی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارا مخلصانہ مشورہ درخور اعتنا ہوگا۔

قواعد

رسالہ "ترجمان القرآن" بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوا کریگا مہینہ کی ۲۵ تاریخ تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھکر منگوا سکتے ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہوں گی انکو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا۔

جو حضرات اپنی جائے قیام کسی طویل مدت کے لئے تبدیل کریں انہیں اپنے جدید پتے کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہئے ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہئے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کے لئے مضامین اور حل طلب مسائل تمام ایڈیٹر کے نام سے بھیجے جائیں لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں ہے کہ ہر چیز شائع کرے۔

منیجر ترجمان القرآن ۔ خیرت آباد۔ حیدرآباد (دکن)

(طابع و ناشر ابوالاعلیٰ مودودی) مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن

آپ کا کتب خانہ

کون کونسی کتابوں سے خالی ہے؟

اِس کا جواب اُن الماریوں سے ملے گا جن میں آپ کی کتابیں چنی ہوئی ہیں۔ نئی دنیا پرانے نظریوں کے متعلق کیا رائے رکھتی ہے۔ اس دور کے مصنفین ہمارے سامنے کیا نئی باتیں پیش کر رہے ہیں۔ شاہراہ ترقی پر کون کس سے آگے ہے اور پہلے کہاں تھا؟ ان تمام سوالات کے جواب آپ کو اپنے کتب خانہ سے ملنے چاہئیں۔ مگر یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ آپ اپنے ذخیرے پر پوری توجہ رکھیں۔ آج آپ اسی نظر سے اپنے کتب خانہ کو دیکھئے۔ اور جو کچھ کمی ہو اسے پورا کرنے کے لئے ہمارے کتب خانے کو لکھئے۔ جہاں عربی، فارسی، اور خصوصاً اردو زبان کی تمام علمی ادبی تاریخی اور فنی جدید و قدیم تصنیفات نہایت تلاش اور جستجو سے مہیا کی جاتی ہیں اور اکثر کمیاب قدیم تصانیف نہایت اہتمام سے خود طبع کرا کر پیش کی جاتی ہیں علاوہ بریں۔

درسی کتابیں منظور شدہ سررشتہ تعلیمات سرکار عالی از انفنٹ تا بی۔ اے کلاس بزبان عربی۔ فارسی۔ اردو، انگریزی، مرہٹی، تلگو، کنڑی وغیرہ نیز کنڈر گارٹن ماڈل کے مینٹ و نقشہ جات دیواری رنگین ہر قسم کے چارٹس اسباق الاشیاء وغیرہ مدارس کے و دیگر دفاتر کے فارمس اور ڈرائنگ کا سامان بالکل واجبی قیمتوں پر حاصل کیجئے